وارث

اقبال کاظمی

ابتدائیہ

سید اقبال حسین کاظمی مقبول عام رسائل و جرائد کا ایک نہایت اہم نام تھے۔ وہ فروری 1943ء کو لاہور میں سید مراتب علی شاہ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی اور پھر والد کی محکمہ جاتی مصروفیات کے سبب کوئٹہ چلے گئے۔ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انہوں نے کوئٹہ سے کیا جہاں وہ سالہا سال روزنامہ "نوائے وقت" کے نمائندے رہے۔ اپنی صحافیانہ مصروفیات کے سلسلے میں انہوں نے بلوچستان کے طول و عرض کے دورے کیے۔ جنرل موسیٰ خان، نواب اکبر بگٹی اور میر غوث بخش بزنجو کے علاوہ انہوں نے بلوچستان کے جن دوسرے سرداروں کے انٹرویو کیے، وہ لوگوں میں بہت مقبول ہوئے اور ان کی صحافیانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھے۔

کوئٹہ کے قیام کے دوران انہیں کہانیاں لکھنے کا شوق ہوا اور جلد ہی وہ مہماتی، جاسوسی اور رومانی ناولوں اور کہانیاں لکھنے والوں میں ایک بڑا نام بن گئے۔ انہوں نے "اقبال کاظمی" کے علاوہ کئی قلمی ناموں سے سینکڑوں ناول اور کہانیاں تحریر کیں۔ 1970ء کی دہائی میں انہوں نے کراچی کا رخ کیا۔ اور اس کے بعد زندگی کے آخری سانس یعنی 25 مئی 2001ء تک وہ کراچی میں ہی مقیم رہے۔

یہاں انہوں نے اپنی تحریری زندگی کا آغاز "عالمی ڈائجسٹ" سے کیا اور اس کے بعد مسٹری میگزین، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ، نئے افق، اور دیگر متعدد مقبول عام ڈائجسٹوں کے لیے انہوں نے بلا مبالغہ سینکڑوں نہیں ہزاروں کہانیاں لکھیں۔ ان کے لکھے ہوئے مقبول عام سلسلے گرداب، آگ، زنداں، اور دشت جنوں کے نام سے حال ہی میں کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں جن کے کئی ایڈیشن فروخت ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے ناول اشاعت کے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ نک ویلوٹ کی ورجنوں کہانیاں ان کے قلم سے نکلیں اور پیری میسن سے لے کر جیفری آرچر تک کی سینکڑوں انگریزی کہانیاں انہوں نے اردو میں منتقل کیں۔ ان دنوں ان کا نہایت مقبول سلسلہ وار ناول "آتش فشاں" جاسوسی ڈائجسٹ میں قبول عام اور شہرت دوام حاصل کر رہا ہے۔

ماہنامہ فاتح میں "انگارے" مسٹری میگزین میں "سمانہ" اور "ماسٹر" اس کے علاوہ ماہنامہ نئے افق میں "مافیا" کے نام سے ان کے قسط وار سلسلے اس وقت بھی شائع ہو رہے تھے۔ انہوں نے جب روزنامہ "جنگ" کے ادارے سے وابستگی اختیار کی تو اس روزنامے

میں "جنگ ڈائجسٹ" کا آغاز کیا۔ ہفت روزہ "اخبار جہاں" میں ان کا قسط وار ناول "آگ" بے پناہ مقبول ہوا۔

وہ ایک خلاق ذہن رکھتے تھے تب ہی سینکڑوں ناقابلِ فراموش کردار تخلیق کر سکے۔ ہر کردار نیا تھا' ہر پچویشن دوسری سچویشن سے مختلف تھی۔ انہوں نے ان ملکوں اور شہروں کی کہانیاں لکھیں جہاں انہوں نے کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا لیکن نقشہ جات' کتابوں اور ٹورسٹ گائیڈ کی مدد سے وہ سڑکوں' گلیوں' بازاروں' ریستورانوں اور تفریح گاہوں کا محل وقوع اس حد تک درست لکھتے ہیں کہ ان شہروں سے اقبال کاظمی کے نام آنے والے خطوط میں یہ اصرار ہوتا تھا کہ وہ اپنا پتہ بتائیں کہ ان سے ملاقات کی جاسکے یا انہیں اپنے گھر ٹھہرایا جا سکے۔ اپنے کام سے اسی عشق اور لگن نے انہیں اس مقام پر پہنچایا کہ وہ مقبول عام رسائل و جرائد کا ایک اہم نام بن گئے۔

ان کے ذاتی دوستوں میں محمد غوری' احمد اقبال' ایس ایم الیاس اور لاہور کے محمد علی اور عبدالغفار نے آخری وقت تک ان سے دوستی نباہی۔ مرحومین میں عبدالقیوم شاد اور اظہر کلیم سے انہیں دلی وابستگی تھی۔

ڈپٹی کلکٹر یوسف علی کی پوتی اور محمد ابوالخیر کی بیٹی زیرک بانو سے ان کی شادی اپریل 1980ء میں ہوئی۔ انہوں نے آخری سانس تک ایک نہایت خوش و خرم اور آسودہ ازدواجی زندگی گزاری۔ ان کے بیٹوں علی دانش اور محسن رضا کے علاوہ ان کی بیٹیاں ذہینہ کاظمی اور شہربانو کاظمی سب ہی زیرِ تعلیم ہیں۔ سوگواروں میں ان کی شریک حیات اور بچوں کے ساتھ ساتھ اردو کی مشہور افسانہ نگار اور کالم نویس زاہدہ حنا' جادہ عتیق اور محمد رحمت کے علاوہ ایک بھائی' دو بہنیں' متعدد بھانجیاں بھانجے' بھتیجے اور بھتیجیاں شامل ہیں۔

زندگی میں اقبال کاظمی کو محفل آرائی کا بے پناہ شوق تھا' اب یاسین آباد قبرستان میں سوتے ہیں تب بھی تنہا نہیں' اپنی خوش دامن محترمہ شمس النساء اور اپنے رشتے کے بہنوئی قریش بخاری کی ہمسائیگی انہیں حاصل ہے۔ وہ ایک بھرپور زندگی گزار کر رخصت ہو چکے' ان کے سوگوار اب یہی کہہ سکتے ہیں کہ:

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

زاہدہ حنا

رات حد درجہ بھیانک اور طوفانی تھی۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور مسلسل کئی گھنٹوں سے بارش ہو رہی تھی۔ ایسی حالت میں اگر ہوا میں بھی تیزی آ جائے تو قیامت ہی ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہی کیفیت تھی..... بارش نے ہوا کے جھکڑوں سے مل کر طوفانی شکل اختیار کر لی تھی سڑکیں گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ سڑکوں پر کھمبوں کے بلب بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے روشنی سے محروم ہو چکے تھے۔ راستے ویران اور سنسان تھے۔ بارش اور ہوا کے طوفان کی آوازوں کے علاوہ اور کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پورا شہر اس لحاظ سے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہاں انسانی آوازیں نہیں تھیں۔

ابھی رات کے دس ہی بجے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شہر عرصے سے ویران پڑا ہے اور بارش اور ہوا کے طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ پانی کے گرنے کی آوازیں ماحول پر اور بھی ہیبت طاری کر رہی تھیں۔

نکسالی کی ایک تنگ و تاریک اور سنسان گلی کے نکڑ والے ایک خستہ مکان پر اس سے بھی زیادہ وحشت اور ویرانی طاری تھی۔ ٹوٹے پھوٹے اس مکان کے ایک کمرے میں جھلنگا سی چارپائی پر علی خان دنیا و مافیہا سے بے خبر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا پڑ چکا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور گال پچکے ہوئے۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ ویرانی نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ نبض بدن کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن کسی نہ کسی طور ابھی تک جاری تھی۔ یہ دھڑکن بھی ماحول کی اداسیوں سے متاثر ہو کر اس قدر مدھم آواز اور اس قدر کم رفتار سے جاری تھی جیسے اسے خوف ہو کہ اس کی حرکت کوئی محسوس نہ کر لے۔ اس کی حرکت سے ماحول کی ویرانیاں' کمرے کی اداسیاں اور علی خان کے چہرے

پر چھائی ہوئی پژمردگیاں دور نہ ہو جائیں۔

کمرے میں مٹی کے تیل کا دیا جل رہا تھا جس کی زرد مدھم روشنی اس تاریک اور خاموش فضا میں ایسے لگتی تھی جیسے رات کے مزار پر کسی بیوہ نے مٹی کا چراغ جلایا ہو اور وہ مٹی کا چراغ اس شش و پنج میں مبتلا ہو کہ ان ہاتھوں نے یہ جو روشنی کا ہالہ بنانے کی کوشش کی ہے' کامیاب بھی ہو گی یا نہیں .....

چارپائی کے سرہانے ایک پرانی کرم خوردہ سی تپائی پڑی ہوئی تھی جس پر ایک گلاس اور دوا کی ایک خالی شیشی اپنی بے بسی کا اظہار کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

کمرے کی دیواریں عرصے سے سفیدی نہ ہونے کی وجہ سے سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ فرش پر پھٹی پرانی دری بچھی ہوئی تھی جس پر جابجا میل اور چکناہٹ کے دھبے لگے ہوئے تھے اور اِدھر اُدھر چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

دیوار کے ساتھ دری پر ایک میلے چکٹ لحاف میں نو سالہ بشارت اور اس سے عمر میں دو سال بڑی بہن نجمہ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں منہ اٹھائے باپ کی چارپائی کی طرف اداس اداس اور ویران سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جبکہ پائنتی کی جانب بیٹھی رضیہ اپنے شوہر کی لمحہ بہ لمحہ بگڑتی ہوئی حالت دیکھ کر اپنے سہاگ کے ٹوٹتے ہوئے سہارے کو بچانے کی فکر میں مستغرق تھی۔

لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے آخر کار رات کے تاریک سائے رفتہ رفتہ اپنے پر سمیٹنے لگے اور ہلکا ہلکا ملگجا سا اجالا دنیا کو ایک نئی صبح کا پیغام دینے لگا تھا۔

بارش اب تھم چکی تھی۔ چھت پر جمع پانی قطرہ قطرہ نیچے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں گر رہا تھا۔ گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی ٹپ ٹپ طلوع ہوتی ہوئی صبح کا سکوت مجروح کر رہی تھی۔

بشارت ماں کے قریب کھڑا کبھی باپ کے ویران چہرے اور کبھی ماں کو تکنے لگتا۔ اس کے قریب ہی نجمہ بھی کھڑی آنکھیں مل رہی تھی۔

دفعتاً علی خان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور ویران ویران نظروں سے رضیہ اور بچوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے خشک ہونٹ ہلے۔ شاید وہ کچھ کہہ رہا تھا لیکن آواز اتنی مدھم تھی کہ سنائی نہ دے رہی تھی۔ رضیہ

اس کے چہرے پر جھک گئی۔ علی خان کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس نے نظریں پھیر کر میز پر پڑی ہوئی دوا کی خالی شیشی کی طرف دیکھا۔ رضیہ ان اجڑی ہوئی نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔

اس نے دوا کی خالی شیشی اٹھا کر دیکھی۔ گلاس میں سے کچھ پانی اس میں ڈالا اور شیشی کو خوب اچھی طرح ہلا کر پانی پیالی میں انڈیل دیا اور ایک ہاتھ علی خان کی گردن میں ڈال کر اس کا سر ذرا سا اوپر اٹھایا اور پیالی اس کے ہونٹوں سے لگا دی اور منہ پھیر لیا۔ اس کی بوجھل پلکوں پر رکے ہوئے آنسو ٹوٹے ہوئے موتیوں کی طرح نیچے گر کر میلی دری میں جذب ہو گئے۔

دن کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی۔ پڑوس میں رہنے والا تیرہ چودہ سال کی عمر کا ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ رضیہ چارپائی سے اتری اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جا کر ہولے ہولے کچھ کہنے لگی۔ لڑکا واپس چلا گیا۔

اور پھر آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس آیا تو دروازے کی چوکھٹ کے قریب ہی سر جھکا کر کھڑا ہو گیا اور اشاروں ہی اشاروں میں رضیہ کو کچھ سمجھانے لگا لیکن علی خان اپنی بیوی سے پہلے ان اشاروں کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے چارپائی کی پٹی سے لگے کھڑے بشارت کو اشارے سے قریب بلایا۔ بشارت ماحول کی اداسیوں اور گھر کی ویرانیوں سے خوفزدہ اور سہما ہوا باپ کے قریب گیا۔ باپ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اسے اور بھی خوفزدہ کر دیا۔

علی خان نے اپنا نحیف استخوانی ہاتھ بمشکل اٹھا کر اس کے سر پر رکھا۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ آواز بمشکل بشارت کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"پتر..... یہ ڈاکٹر..... پیسوں کے بغیر..... نہیں آیا کرتے..... تم بڑے ہو جاؤ تو ڈاکٹر..... اقبال بننے کی..... کوشش کرنا..... تاکہ..... دنیا کو..... جینے کا..... مقصد سمجھا..... سکو....."

علی خان نے نجمہ اور رضیہ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ زندگی ہار گئی۔ بے رحم موت جیت گئی۔

افق پر آگ جیسی سرخی پھیل رہی تھی۔ ایک سورج دنیا کو اپنی روشنی سے منور

کرنے کے لئے طلوع ہو رہا تھا اور دوسرا ایک گھر کو زندگی کی تاریک راہوں پر دھکیل کر غروب ہو گیا۔

ماں کو روتے دیکھ کر نجمہ اور بشارت بھی رونے لگے۔ محلے کے کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے اور پھر دوپہر کے وقت علی خان کو چارپائی پر ڈال کر لے گئے اور قبرستان کے بھیانک غاروں میں ایک اور کا اضافہ کر آئے۔

محلے کے لوگ علی خان کو چارپائی پر ڈال کر لے جانے لگے تو بشارت کا خیال تھا کہ شام ہونے سے پہلے پہلے اس کے ابا واپس آجائیں گے۔ جیسا کہ پہلے آیا کرتے تھے لیکن وہ نہ آئے۔ دوسرے دن بھی نہ آئے..... اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا۔

بشارت زندگی اور موت کا فلسفہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنے باپ کی واپسی کا منتظر رہنے لگا اور ماں اور بہن کو دیکھ دیکھ کر وہ بھی روتا رہا۔

اور پھر ایک روز اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ محلے والے اسے بھی چارپائی پر ڈال کر لے گئے۔ بشارت کا خیال تھا کہ ابا کہیں دور چلے گئے ہیں لیکن امی رات کا اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ضرور لوٹ آئیں گی۔ اسے اور نجمہ کو انہوں نے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا لیکن وہ بھی واپس نہ آئیں۔ نجمہ اور بشارت دن بھر گھر کے ایک کونے میں بیٹھے روتے رہے۔

دوسرے دن محلے کے ایک بزرگ ان کے گھر آئے۔ ان کے سروں پر دست شفقت رکھا اور جب بشارت نے ان سے سوال کیا کہ امی کیوں نہیں آئیں تو ان کی سفید داڑھی پر آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔

"پتر..... جب بندہ مرجاتا ہے تو واپس نہیں آیا کرتا۔"

بشارت اپنا سوال بھول کر ان کی داڑھی پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھنے میں محو تھا۔ کسی خواب کی طرح ان کے الفاظ بشارت کے ذہن میں گونج رہے تھے۔

"جب انسان مرجاتا ہے تو واپس نہیں آیا کرتا....."

کتنے ہی روز گزر گئے۔ نجمہ اور بشارت اکیلے رہ گئے تھے اور پھر ایک دن بشارت محلے کے اس سفید ریش بزرگ کے پاس جا پہنچا۔

"آ بھئی بشارت پتر' کیا بات ہے یہاں بیٹھ جا۔" بزرگ نے اسے اپنے قریب چارپائی

پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بشارت خاموشی سے ان کے قریب بیٹھ گیا اور پھر اچانک ہی ایک سوال کر ڈالا۔

"ڈاکٹر اقبال کون ہے بابا؟"

سفید ریش بزرگ بشارت کے منہ سے ڈاکٹر اقبال کا نام سن کر چونک گئے۔ شاید انہیں اس عمر کے بچے سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ پہلے تو وہ حیران ہوئے اور پھر بشارت کی انگلی پکڑ کر بادشاہی مسجد کی جانب لے گئے اور جب وہ مسجد کی سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے ان سیڑھیوں کے پاس بنے ہوئے ایک چھوٹے سے مزار میں داخل ہوئے تو بشارت حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اسی لمحے اس کی سماعت سے بزرگ کی آواز ٹکرائی۔

"پتر..... یہ ہیں ڈاکٹر اقبال۔" ساتھ ہی اس سفید ریش بزرگ نے قبر کی طرف اشارہ کیا۔

اس وقت پتہ نہیں بشارت کو کیا ہوا کہ وہ قبر سے لپٹ کر رونے لگا اور اس قدر آنسو بہائے کہ ماں باپ کی موت پر بھی نہیں بہائے ہوں گے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے باپ نے مرتے وقت ڈاکٹر اقبال کا نام لیا تھا اور ان کی قبر دیکھ کر اسے اپنے ابا کی موت کا منظر یاد آگیا تھا۔

اور پھر یہ بشارت کا معمول بن گیا کہ وہ دن کا بیشتر وقت ڈاکٹر اقبال کے مزار پر گزارتا اور باقی وقت اس بزرگ کے پاس چلا جاتا جو اسے اقبال کی زندگی کے حالات بتایا کرتا۔ اس نے بشارت کو ڈاکٹر اقبال کی کتنی ہی نظمیں ازبر کروادیں۔ بشارت کو جب بھی کوئی نظم یاد ہوتی وہ فوراً مزار پر جاتا اور بلند آواز سے ڈاکٹر صاحب کی قبر کو سناتا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنی نظمیں سن کر ڈاکٹر صاحب خوش ہوتے ہوں گے۔

جس روز بشارت نے ڈاکٹر اقبال کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز میں شکوہ جواب شکوہ پڑھا اس روز اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ سارا دن سینہ تان کر پھرتا رہا۔ اس خوشی میں اسے رات کو بھی دیر تک نیند نہیں آسکی تھی۔

اور پھر ایک دن قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔ وہ سفید ریش بزرگ بھی قبر میں چھپ گیا۔ لاہور کی گنجان گلیوں میں بشارت پھر تنہا رہ گیا۔ اس کے دن پھر تاریک

ہو گئے اور راتیں ایک بار پھر سنسان ہو گئیں۔ اس کو جو سہارا ملا تھا وہ پھر اس سے چھن گیا۔

ایک روز بشارت انتہائی افسردہ' مزار کے باہر بیٹھا بلند آواز سے شکوہ پڑھ رہا تھا کہ بڑے اچھے سوٹ میں ملبوس ایک شخص آیا۔ اس نے بشارت پر ایک نظر ڈالی اور مزار کے اندر چلا گیا۔ بشارت اپنی دھن میں مست دنیا و مافیہا سے بے خبر دیوار سے ٹیک لگائے شکوہ پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شخص باہر نکلا۔ چند لمحوں تک بشارت کے قریب کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر ایک چونی اس کے سامنے پھینک کر چل دیا۔

بشارت کو اس وقت ندامت بھی ہوئی غصہ بھی آیا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گیا اور چونی اٹھا کر دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا۔ چونی اس شخص کو دی اور واپس آ کر قبر سے لپٹ کر رونے لگا۔ وہ شخص اسے بھکاری سمجھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ علامہ کے مزار کے پاس بیٹھ کر بشارت جیسا معصوم اور حساس لڑکا بھیک مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ کتنی دیر تک روتا رہا اور اس کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا تو اس نے علامہ سے کہہ دیا۔

"آئندہ میں شکوہ نہیں پڑھوں گا' بلند آواز سے شکوہ پڑھنے والوں کو لوگ منگتا سمجھتے ہیں۔ میں منگتا نہیں بننا چاہتا' میں اقبال بننا چاہتا ہوں۔"

پھر اس کے دن اقبال کے مزار کی بجائے اسکول کی چار دیواری میں بسر ہونے لگے۔ اسکول بھی وہ خود ہی گیا' ماسٹر صاحب نے بھی نہ جانے کیا سوچ کر اسے دوسرے بچوں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے پاس کتابیں نہیں تھیں، قلم دوات اور تختی نہیں تھی۔ وہ دوسرے بچوں کی کتابوں سے استفادہ کرتا رہا۔ سلیٹ پر لکھنے کی تو اسے حسرت ہی رہی۔ ٹک ٹک کر کے جب اس کے ہم جماعت لڑکے اپنی اپنی سلیٹ پر لکھتے تو نہ جانے اس کا دل کیوں بھر آتا۔ جیسے یہ ٹک ٹک سلیٹ پر نہیں اس کے دل پر ہو رہی ہو۔

زندگی کے تین سال ختم ہو گئے۔ وہ چوتھی جماعت میں آ گیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس کے حالات جاننے کے بعد ترس کھا کر اسے کتابیں بھی لے دیں اور اسکول کے بعد اپنے گھر کے کام کاج پر لگا لیا۔ اسکول بند ہونے کے بعد بشارت ہیڈ ماسٹر کے گھر چلا جاتا اور رات دیر تک ان کے ہاں کام کرتا اور پھر رات کا کھانا کھا کر اپنے گھر چلا آتا۔ آتے ہوئے

وہ کچھ بچا کھچا کھانا اپنی باجی نجمہ کے لئے بھی لے آتا۔

بشارت بہت خوش تھا کہ وہ مزدوری کرتا ہے۔ بھیک نہیں مانگتا۔ اسے اب نجمہ کی بھی زیادہ فکر نہیں تھی۔ محلے کے ایک امیر شخص کی بیوی نے ترس کھا کر اسے اپنے گھر ملازم رکھ لیا تھا۔ جہاں وہ سارا دن جھوٹے برتن مانجھتی' جھاڑو پونچھا کرتی اور گھر کے چھوٹے بچوں کو کھلایا کرتی۔ اس کے معاوضے میں اسے بچا کھچا کھانا مل جاتا جس میں سے وہ خود کھاتی اور کچھ بشارت کے لئے لے آتی۔

بشارت نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ اسکول سے وہ سیدھا ہیڈ ماسٹر کے گھر جاتا اور رات دیر تک کام میں جتا رہتا۔ اس ملازمت نے اسے اسکول کی کتابیں تو دے دیں لیکن اس کی زندگی کی راحتیں چھین لیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ رات کو گھر آتا تو پڑھنے بیٹھ جاتا۔ تھکن سے چور۔ جب اس پر غنودگی طاری ہوتی تو وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اگر اونگھتے ہوئے ذہن میں کوئی یاد ہوتی تو صرف ہیڈ ماسٹر کے نوجوان بیٹے کی گھرکیاں اور ان کی بیگم صاحبہ کے تھپڑ جو اکثر اس کے رخساروں کو نوازتے رہتے تھے۔

بشارت ایک بار نہیں کئی مرتبہ ہیڈ ماسٹر کے بیٹے سے پٹ چکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی موٹی بھینس نما بیوی اس کے ساتھ زر خرید غلاموں جیسا سلوک کرتی۔ ایک شام برتن دھوتے ہوئے بشارت سے چائے کا کپ ٹوٹ گیا۔ بیگم صاحبہ چھناکے کی آواز سن کر فوراً ہی کچن میں پہنچ گئیں۔ انہوں نے کپ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھا اور پھر باورچی خانے میں جیسے طوفان آ گیا۔

"حرامزادے..... کمین..... کتے..... اندھا ہوا تھا کیا..... تیرے ہاتھوں میں طاقت نہیں موئے..... تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں حرامخور..... کہیں کے اتنا قیمتی کپ توڑ دیا۔"

ہیڈ ماسٹر کی بیوی چلاتی رہی۔ پھر اس کے ہاتھ اور پیر بھی حرکت میں آ گئے۔ تھپڑ' گھونسے اور ٹھوکریں بشارت کے جسم پر پڑتی رہیں اور وہ خاموشی سے سہتا رہا۔ اس پر بھی ہیڈ ماسٹر کی بیوی کا غصہ کم نہ ہوا تو اس نے چولہے سے جلتی ہوئی لکڑی پکڑ لی اور ایک مرتبہ پھر بشارت کی پٹائی شروع کر دی۔

وہ کہاں تک برداشت کرتا۔ دبی دبی سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں۔ جلتی ہوئی لکڑی

کی مار سے اس کا جسم کئی جگہوں سے جھلس گیا اور جب وہ پٹتے پٹتے بیہوش ہو گیا تو بیگم صاحبہ نے اپنے بڑے لڑکے کو بلا لیا جو بشارت کو اٹھا کر اس کے گھر ڈال آیا۔

بشارت کئی روز تک گھر سے نہیں نکل سکا۔ اس کی ٹانگوں میں درد تھا۔ سر کی چوٹ میں بھی ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ بازو دو تین جگہ سے جھلس گئے تھے۔ زخموں میں شدید جلن ہوتی رہی۔ وہ چارپائی پر پڑا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اگلی جماعت میں داخلہ کیسے ہوگا؟ کتابیں کہاں سے آئیں گی۔ کھانے کو کہاں سے ملے گا اور..... اقبال کیسے بنوں گا؟

کئی روز بعد جب وہ ٹھیک ہوا تو نجمہ کے جمع کئے ہوئے پیسوں سے اس نے پالش کی ڈبیہ اور برش خرید لیا۔ ہیڈ ماسٹر کے گھر والوں کے جوتے پالش کرتے ہوئے اسے پالش کرنے کا طریقہ آ گیا تھا۔ وہ علامہ اقبال کے مزار کے سامنے بیٹھ گیا اور وہاں آنے والوں کے جوتے پالش کرنے لگا۔

بشارت کے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے تو اس نے پانچویں کلاس میں داخلہ لے لیا اور کتابیں بھی خرید لیں۔ ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ اب وہ چھٹی کلاس میں آ گیا تھا۔

اس روز علامہ اقبال کی برسی منائی جا رہی تھی۔ مزار کے سامنے ایک بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بشارت کو بھی اسکول کی طرف سے اپنے مخصوص لب و لہجے میں اقبال کی ایک نظم سنانی تھی۔

جلسے میں سینکڑوں لوگ تھے۔ بشارت اسٹیج پر کھڑا ترنم سے نظم پڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی جو اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک معزز آدمی کی جیب سے بٹوا نکال رہا تھا۔

بشارت نظم چھوڑ کر چور چور کا شور مچاتا ہوا بھاگا اور اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جلسے میں افراتفری سی پھیل گئی۔ پولیس نے اس نوجوان کو حراست میں لے لیا اور تھوڑی دیر بعد جلسے کی کارروائی دوبارہ شروع ہو گئی۔

اس واقعہ کے تقریباً آٹھ ماہ بعد شام کے وقت بشارت' اقبال کے مزار سے واپس لوٹ رہا تھا کہ راستے میں وہی نوجوان مل گیا۔ بشارت اسے بھول چکا تھا لیکن اس نوجوان

نے اسے یاد رکھا تھا۔ وہ بشارت کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں ہوتے ہوئے وہ ایک مکان میں پہنچ گئے۔ نوجوان نے بشارت کو کمرے میں دھکیل کر اندر سے کنڈی چڑھائی۔

اقبال کی برسی پر نظم تم نے پڑھی تھی؟"

"جی ہاں۔" بشارت نے فخر سے سینہ تان کر کہا۔

"اور چور چور کا شور بھی تم نے ہی مچایا تھا؟" نوجوان نے اسے گھورا۔

"جی ہاں۔" بشارت نے جواب دیا لیکن جونہی اس نے نوجوان کو غور سے دیکھا اسے یاد آ گیا کہ چور تو یہی تھا۔ اس نے اس شخص کی جیب سے بٹوا نکالا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ نوجوان اسے یہاں کیوں لایا تھا۔

"اور تمہاری وجہ سے مجھے سات مہینے جیل کاٹنی پڑی۔" اس نوجوان نے کہا۔

"لیکن بھائی جان۔ چوری کرنا بری بات ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔

وہ نوجوان اسے چند لمحے گھورتا رہا اور پھر اچانک ہی ایک زوردار تھپڑ بشارت کے گال پر پڑا۔

بشارت لڑکھڑا گیا۔ وہ اپنا گال سہلانے لگا اور پھر تھپڑ' گھونسے' ٹھوکریں' بشارت کے جسم پر برسنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اس کی قوت برداشت آہستہ آہستہ جواب دینے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک سائے ناچنے لگے۔ سر چکرانے لگا اور وہ بے دم سا ہو کر فرش پر گر گیا۔

نوجوان کو پھر بھی اس پر رحم نہ آیا۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا صحن میں لے آیا اور نل کے نیچے بٹھا کر پانی کھول دیا۔ سردیوں کی شام اور یخ بستہ پانی۔ بشارت اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس شخص کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس نے بشارت کو نل کے نیچے بٹھائے رکھا اور جب وہ بیہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا تو اس شخص نے اسے گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔

صبح سویرے جب اسے ہوش آیا تو وہ ایک گلی میں پڑا ہوا تھا اور ایک آدمی اس پر جھکا اسے ہلا رہا تھا۔ بشارت نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس نیک مرد نے اسے اٹھا کر گھر پہنچا دیا۔

بشارت کئی روز تک بخار میں پھنکتا رہا۔ نجمہ اس کے لئے باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔ ملک صاحب کے گھر نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھائی کی بھی ہر ممکن دیکھ بھال کرتی رہی۔ کئی روز بعد بشارت گھر سے نکلا۔ بخار نے اسے بری طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کمزوری اتنی تھی کہ ٹھیک سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ گھر سے کچھ فاصلے پر ایک گلی کی نکڑ پر بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کرتا رہا۔

بشارت اب اسکول نہیں جا رہا تھا۔ فیس نہ ہونے اور بہت سی غیر حاضریوں کی وجہ سے اس کا نام کٹ گیا تھا لیکن اس کا پڑھنے کا شوق کم نہیں ہوا تھا۔ وہ گلی کی نکڑ پر بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کرتا اور اپنی کتابیں پڑھتا رہتا۔ پڑھنے میں کوئی مشکل آن پڑتی تو وہ کسی راہ گیر سے پوچھنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کرتا۔

اس روز شام کو ایک گاہک جوتے پالش کروا کر جانے لگا تو بشارت نے اسے روک لیا اور کتاب کھول کر اس سے کچھ پوچھنے لگا۔ اس آدمی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بشارت کو بھولا ہوا سبق بتا دیا اور خود اس کے بارے میں بھی تفصیل پوچھنے لگا۔ بشارت معصومیت سے سب کچھ بتاتا رہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔" وہ آدمی بولا۔ "میرا نام صفدر ہے۔ میں اس تیسری گلی کے نکڑ والے مکان میں رہتا ہوں۔ تم اگر پڑھنا چاہو تو ہر روز فارغ ہو کر میرے پاس آ جایا کرو، میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔"

"آپ کو فیس کہاں سے دوں گا۔ میرے پاس تو کتابیں خریدنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

اس بات پر اس آدمی کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے قریب ہو کر اس کا کندھا تھپتھپایا اور بولا۔

"تم فیس اور کتابوں کی فکر نہ کرو۔ سب ہو جائے گا۔ بس کل سے تم آ جانا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ مگر بشارت کی معصوم نگاہیں اس وقت تک اس کا تعاقب کرتی رہیں جب تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اللہ میاں نے ابا کی سفارش پر اسے ڈاکٹر اقبال بنانے کے لئے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ اب وہ بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کرنے لگا کہ گھر جا کر نجمہ کو اس فرشتے کے بارے میں

بتائے۔

"یہ بہت اچھا ہے۔ تم خوب دل لگا کر پڑھ لو بھیا۔" نجمہ نے اس کی بات سن کر کہا۔

"ہاں میں خوب پڑھوں گا۔ بہت سا پڑھوں گا۔ میں اقبال بنوں گا۔ پھر سب لوگ میری قدر کریں گے۔ ابا نے کہا تھا کہ تم ڈاکٹر اقبال بننا۔ ڈاکٹر اقبال بہت اچھے آدمی تھے۔" جوش اور مسرت سے وہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ اس رات وہ سویا تو خواب میں خود کو ڈاکٹر اقبال کے روپ میں دیکھتا رہا جس کے ارد گرد بہت سارے لوگ جمع تھے۔ سب اس کا احترام کر رہے تھے اس نے وہاں اماں ابا کو بھی دیکھا جو بڑے فخر سے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے۔

وقت دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا رہا۔ دن رات اور راتیں صبح کا پیرہن بدلتی رہیں۔

بشارت کا دن تیزی سے لوگوں کے جوتوں پر برش چلاتے اور اقبال کے شعر گنگناتے گزرتا تھا اور رات کو وہ باؤ صفدر کے گھر پڑھنے کے لئے چلا جاتا۔

اس چھوٹی سی عمر میں زندگی نے اس پر کتنے ہی بوجھ لاد دیئے تھے لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرایا۔ اس کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وقت کی طوفان خیز اور تاریک آندھیاں بھی اسے راہ سے نہ بھٹکا سکیں اور وہ جرأت و استقلال کا پیکر بنا وقت دھکیلتا آگے ہی بڑھتا رہا۔

اب اس نے بوٹ پالش چھوڑ کر انار کلی میں گھوم پھر کر بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے فروخت کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اس میں چار پیسے بچ جاتے تھے۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں دن بھر انار کلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتا رہتا۔ شام ہوتے ہوتے وہ بری طرح تھک جاتا لیکن اس نے باؤ صفدر کے ہاں جانے سے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا۔

اس روز باؤ صفدر کے مکان پر پہنچ کر اس نے حسب معمول دستک دی اور باؤ صفدر کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور پھر کمرے کے دروازے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

کمرے میں صوفوں پر باؤ صفدر کے علاوہ تین آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ

سب قیمتی لباس میں تھے۔ ان کے سامنے کافی ٹیبل پر چائے کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ بشارت دروازے میں رک کر ایک ایک کی شکل دیکھنے لگا۔ ان تینوں نے بھی بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"آؤ بھئی' رک کیوں گئے۔" باؤ صفدر نے اسے رکتے دیکھ کر کہا۔

بشارت آگے بڑھ کر ایک کونے میں قالین پر بیٹھ گیا اور کتابیں کھول کر پڑھنے لگا۔ صوفوں پر بیٹھے ہوئے تینوں آدمی اب بھی گہری نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بشارت نے بھی دو تین مرتبہ نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا اور ہر مرتبہ انہیں اپنی ہی طرف متوجہ پا کر نظریں جھکالی تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ آدمی چلے گئے اور باؤ صفدر بھی بشارت کے قریب ہی قالین پر بیٹھ کر اسے پڑھانے لگا۔

ایک گھنٹہ پڑھنے کے بعد بشارت کتابیں سمیٹ کر جانے لگا تو باؤ صفدر نے اسے روک لیا۔

"تم گھر تو جا رہے ہو' میرا ایک کام بھی کرتے جاؤ۔"

"جی کہئے۔" بشارت نے کہا۔

"ذرا ایک منٹ رکو۔" باؤ صفدر کہتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی واپسی دو تین منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں براؤن کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا جس کے گرد موٹا دھاگا لپٹا ہوا تھا اور دھاگے کی گرہ پر دیکس سے مہر لگی ہوئی تھی۔

"یہ پیکٹ خان صاحب کو دینا ہے۔" باؤ صفدر نے کہا۔ "تم خان صاحب کو تو جانتے ہی ہو نا۔ وہی جن کا مکان لائبریری کے ساتھ ہے۔ تم پہلے بھی دو تین مرتبہ وہاں جا چکے ہو۔"

"جی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔

"اس پیکٹ کو اچھی طرح سنبھال کر بیگ میں رکھ لو۔ راستے میں کہیں گرا مت دینا اور اس کاغذ پر خان صاحب سے دستخط کروا لینا۔" باؤ صفدر نے براؤن پیکٹ اور ایک کاغذ بشارت کو دے دیا جس پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

بشارت نے دونوں چیزیں سنبھال کر بیگ میں رکھ لیں۔ بیگ کیا کپڑے کا تھیلا تھا

جس میں وہ کتابیں رکھا کرتا تھا۔ جب وہ جانے لگا تو باؤ صفدر نے اسے خاص طور پر یہ ہدایت بھی کر دی کہ گھر جانے سے پہلے وہ خان صاحب کا دستخط شدہ کاغذ اسے دیتا ہوا جائے۔

بشارت تنگ گلیوں سے نکل کر بازار والی سڑک پر آگیا۔ یہ سڑک شاہی محلے سے ہوتی ہوئی بادشاہی مسجد اور شاہی قلعے کی طرف چلی گئی تھی لیکن اسے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ بازار کے پہلے چوک سے دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ بھی تنگ سا بازار تھا۔ ساری دکانیں کھل ہوئی تھیں اور بڑی رونق ہو رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر وہ ایک اور گلی میں مڑ گیا اس گلی کے تیسرے مکان کی بیٹھک میں ایک لائبریری بنی ہوئی تھی۔ دروازے کے اوپر لائبریری کا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ساٹھ واٹ کا بلب روشن تھا۔ بشارت اگلے مکان کے دروازے پر رک گیا۔ دستک کے جواب میں ایک دبلا پتلا منحنی سا شخص دروازے پر نمودار ہوا۔

"کون ایں توں۔ کس سے ملنا ہے!" اس شخص کے لہجے میں بڑی کرختگی تھی۔

"خان صاحب سے ملنا ہے۔ مجھے باؤ صفدر نے بھیجا ہے۔" بشارت نے کہا۔

باؤ صفدر کا نام سن کر منحنی سادہ شخص چونک سا گیا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ کر راستہ دیتے ہوئے بولا۔

"وہ سامنے والے کمرے میں چلے جاؤ خان جی اندر بیٹھے ہیں۔"

بشارت پہلے بھی اس قسم کے پیکٹ لے کر دو تین مرتبہ یہاں آ چکا تھا اور ہر مرتبہ باؤ صفدر نے اسے تاکید کی تھی کہ پیکٹ خان صاحب کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں نہ دیا جائے۔ پہلی مرتبہ جب بشارت یہاں آیا تھا تو دروازہ کسی اور نے کھولا تھا اور وہ اندر داخل ہوتے ہوئے کچھ جھجکا تھا لیکن اس مرتبہ وہ راستے ملتے ہی بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔

بشارت کے اندر داخل ہونے کے بعد اس منحنی سے شخص نے گردن نکال کر گلی میں دائیں بائیں جھانکا پھر دروازہ بند کر دیا اور بشارت کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزر کر وہ شخص ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ اگرچہ بھڑا ہوا تھا لیکن دونوں پٹوں کے بیچ میں تقریباً ایک انچ کی خلا نظر آ رہی تھی اور اندر سے دو

آدمیوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس شخص نے دروازہ کھولا اور گردن اندر ڈال کر بولا۔

"خان جی۔ صفدر کا بندہ آیا ہے۔"

کمرے سے باتوں کی آواز آنی بند ہو گئی اور پھر چند لمحوں کے وقفے کے بعد خان صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔

"کہاں ہے۔ اسے یہاں لاؤ۔"

اس شخص نے مڑ کر بشارت کو اشارہ کیا۔ بشارت اندر داخل ہوا۔ پہلے اس نے دوسرے شخص کی طرف دیکھا پھر تھیلے میں سے پیکٹ نکال کر خان صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

"باؤ صفدر نے بھیجا ہے۔"

خان صاحب نے پیکٹ لے کر پہلے اسے باہر سے اچھی طرح دیکھا پھر اسے کھولنے لگا۔ پیکٹ میں پلاسٹک کی ایک تھیلی برآمد ہوئی جس میں آدھا کلو کے لگ بھگ سفید پاؤڈر بھرا ہوا تھا۔ خان صاحب اب بغور تھیلی کا معائنہ کر رہا تھا۔

"باؤ صفدر نے کہا تھا اس کاغذ پر آپ سے دستخط کروا لوں۔" بشارت نے کہتے ہوئے وہ کاغذ بھی آگے بڑھا دیا۔

خان صاحب نے کاغذ لے کر پڑھا۔ ایک بار پھر تھیلی کی طرف دیکھا اور دستخط کر کے کاغذ بشارت کو لوٹا دیا جسے اس نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ خان صاحب نے جیب سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

"اچھا بھئی لڑکے اب تو جا' اور یہ رکھ لے' راستے میں کچھ کھا لینا۔"

بشارت نوٹ لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"او رکھ لے کاکا۔ میں باؤ صفدر کو نہیں بتاؤں گا۔" خان صاحب نے کہا تو بشارت نے نوٹ جیب میں رکھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ منحنی سا شخص سامنے ہی موجود تھا۔ اس نے ڈیوڑھی والا دروازہ کھول دیا۔

بشارت ایک بار پھر یہ پُر پیچ گلیاں طے کرتا ہوا بازار میں آ گیا۔ وہ جب باؤ صفدر کے مکان پر پہنچا تو وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ بشارت نے جیب سے کاغذ نکال کر

اس کے حوالے کر دیا اور جھجکتے ہوئے اسے یہ بھی بتا دیا کہ خان صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے تھے۔

"کوئی بات نہیں۔ لو' یہ بھی رکھ لو۔" باؤ صفدر نے بھی جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیا۔

گھر جاتے ہوئے بشارت کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ جب بھی باؤ صفدر کے دیئے ہوئے پیکٹ لے کر خان صاحب کے پاس گیا تھا تو انہوں نے ہر مرتبہ اسے پانچ روپے دیئے تھے اور واپسی پر باؤ صفدر نے بھی ہر مرتبہ پانچ کا نوٹ دیا تھا۔

خان صاحب اسے بچہ سمجھ کر پیسے دے دیتے ہوں گے لیکن باؤ صفدر..... وہ پیسے کیوں دیتے ہیں۔ وہ تو مجھے بغیر فیس کے پڑھاتے بھی ہیں' کتابیں بھی لے کر دی ہیں۔ وہ تو مجھے چھوٹا بھائی سمجھتے ہیں اور شاید اس لئے وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں' کوئی بہن نہیں اور نہ باؤ صفدر کے ماں باپ ہیں۔ کیا وہ بھی میری طرح یتیم ہیں؟ لیکن نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر باؤ صفدر میری طرح یتیم ہوتے تو ان کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے۔ وہ بھی میری طرح غریب ہوتے۔ وہ یتیم نہیں ہو سکتے۔ ان کے ماں باپ کسی اور جگہ رہتے ہوں گے' ہاں ان کا کوئی چھوٹا بھائی نہیں ہو گا' وہ مجھے چھوٹا سمجھ کر پیسے دیتے ہیں۔"

بشارت کی ذہنی رو بہک گئی۔

"ہاں..... یقیناً ایسا ہی ہے لیکن میں اب آئندہ ان سے کبھی پیسے نہیں لوں گا۔ میں کوئی بھکاری ہوں جو کسی سے پیسے لوں۔ بس آئندہ نہیں لوں گا۔"

ایک سال اور بیت گیا۔ بشارت زندگی کی اس چلچلاتی دھوپ میں ثابت قدمی سے آگے بڑھتا رہا۔ صفدر کے ہاں بھی اس نے کبھی ناغہ نہیں کیا تھا۔ باؤ صفدر اب اسے خان صاحب کے علاوہ وہ براؤن پیکٹ دے کر بعض دوسرے لوگوں کے پاس بھی بھیج دیا کرتا تھا۔ کبھی بھائی' کبھی لکشمی' کبھی دلی دروازے اور کبھی کسی اور جگہ۔ آنے جانے کے کرائے کے علاوہ اب اسے پانچ کے بجائے دس روپے ملنے لگے تھے اور باؤ صفدر نے کہہ دیا تھا کہ یہ پیسے وہ اسے چھوٹا بھائی سمجھ کر ہی دیتا ہے۔

اس روز بھی وہ رات کا کھانا کھا کر کتابوں والا تھیلا اٹھائے باؤ صفدر کے ہاں جانے

کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ جب وہ باؤ صفدر کے مکان والی گلی میں پہنچا تو بھونچکا رہ گیا۔ مکان کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور پولیس کی دو گاڑیاں بھی وہاں کھڑی تھیں۔ بشارت چند لمحے مبہوت سا کھڑا دور ہی سے تماشا دیکھتا رہا پھر دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور لوگوں کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اسے ایک مرتبہ پھر ٹھٹک جانا پڑا۔ دروازے پر پولیس کے دو سپاہی رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ بشارت نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک سپاہی نے اسے ڈانٹ کر پیچھے ہٹا دیا۔

بشارت سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے بھیڑ میں کھڑے دو تین آدمیوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے لیکن کسی نے اسے جواب نہ دیا۔

باہر کا اور سامنے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ بشارت نے ایک پولیس والے کی ٹانگوں میں سے جھانک کر دیکھا تو اس کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔

کمرے کے وسط میں باؤ صفدر، خان صاحب اور دو آدمی اور کھڑے تھے، ان سب کے ہاتھوں میں آہنی کڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک پولیس آفیسر اور اس کے دو ماتحت قالین پر بکھرے ہوئے کتنے ہی چھوٹے بڑے پیکٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ یہ ویسے ہی پیکٹ تھے جو باؤ صفدر اس کے ہاتھ لوگوں کو بھجوایا کرتا تھا۔

"یہ سب کیا ہے۔ یہاں پولیس کیوں آئی ہے؟" بشارت نے سوچا اور ایک مرتبہ پھر مکان میں گھسنے کی کوشش کی مگر کانسٹیبل نے اسے ڈانٹ کر پیچھے ہٹا دیا۔

گلی میں لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پولیس والے باؤ صفدر اور خان صاحب وغیرہ کو باہر لے آئے۔ ان کے پیچھے دو پولیس والوں نے سفید پاؤڈر کے وہ پیکٹ چادروں میں لپیٹ کر اٹھا رکھے تھے۔ باؤ صفدر جیسے ہی قریب آیا بشارت دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔

"باؤ جی۔ یہ کیا ہو گیا۔ آپ کو پولیس والے کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہیں؟"

باؤ صفدر اچانک ہی اپنے سامنے بشارت کو دیکھ کر لرز اٹھا۔ اس کا جھکا ہوا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔

"بشارت میرے دوست۔" وہ مدھم لہجے میں بولا۔ "مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہاری لاعلمی میں تمہیں بھی غلط راستے پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں مجرم ہوں

بشارت، حکومت کا..... قوم کا..... اور..... تمہارا مجرم....."

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں باؤ جی۔" بشارت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ نے مجھے غلط راستے پر کب لگایا؟ آپ تو مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ آپ مجرم کیسے ہو سکتے ہیں۔ باؤ صفدر۔ آپ تو بہت اچھے ہیں۔ آپ نے کیا جرم کیا ہے جو یہ پولیس والے آپ کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں!"

"تم نہیں سمجھ سکو گے بشارت اور نہ ہی کبھی ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ کوشش کرنا کہ تم اپنی تعلیم مکمل کر سکو۔" صفدر نے مدھم سے لہجے میں کہا اور سر جھکائے پولیس والوں کے ساتھ آگے چل پڑا۔

بشارت مبہوت سا کھڑا انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو بھیڑ بھی چھٹنے لگی۔

"پولیس والے باؤ صفدر کو کیوں لے گئے ہیں؟" بشارت نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔

"آخر ایک نہ ایک دن تو قانون کی گرفت میں آنا ہی تھا سالے کو۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "یہ لوگ ہیروئن کے اسمگلر ہیں۔ نوجوان نسل کی رگوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ بہت عیش کر لی ان لوگوں نے۔ اب زندگی بھر جیل میں چکی پیسیں گے تو سب کچھ بھول جائیں گے۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔ تم ابھی بچے ہو کچھ نہیں سمجھو گے۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔"

"ایسے لوگوں کو تو سرعام پھانسے لا دینا چاہئے جی۔" قریب کھڑے ایک اور شخص نے کہا۔ "مگر دیکھ لینا فیر آ جائیں گے یہ۔ ان کے ہتھ بہت بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ قنون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جی۔"

لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ بشارت کتابوں والوں تھیلا کندھے پر لٹکائے وہیں کھڑا رہا۔ کبھی وہ گلی کے اس موڑ کی طرف دیکھتا جس طرف پولیس والے باؤ صفدر وغیرہ کو لے کر گئے تھے اور کبھی مکان کے دروازے پر پڑے ہوئے تالے کو دیکھنے لگتا جو پولیس انسپکٹر نے لگایا تھا۔ کچھ دیر بعد بشارت بھی بوجھل بوجھل سے قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

گھر آ کر بشارت نے نجمہ کو بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ اس کے لئے فکر کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب بشارت پڑھے گا کیسے؟

اس رات بشارت کو دیر تک نیند نہیں آ سکی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار باؤ صفدر کا چہرہ گھوم جاتا۔ اسے بار بار یوں محسوس ہوتا جیسے باؤ صفدر اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا مدھم لہجے میں کہہ رہا ہو۔

"بشارت میرے دوست' مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہاری لاعلمی میں تمہیں غلط راستے پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں قوم کا' قانون کا' اور تمہارا مجرم ہوں۔"

بشارت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ باؤ صفدر جیسا شخص مجرم کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی سمجھ میں تو یہ بات بھی نہیں آ سکی تھی کہ ہیروئن کی اسمگلنگ کیا ہوتی ہے۔ وہ نہ تو ہیروئن کے بارے میں کچھ جانتا تھا اور نہ اسمگلنگ کے بارے میں کبھی کچھ سنا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ صبح کسی سے ان باتوں کا مطلب ضرور پوچھے گا۔

اگلا دن گزر گیا اور دوسرا دن بھی بیت گیا۔ وہ بات بشارت کے ذہن سے نکل گئی کہ اسے کسی سے کچھ پوچھنا تھا۔

☆======☆======☆

لاہور میں میلہ چراغاں شروع ہو چکا تھا۔ لوگ جوق در جوق شالا مار باغ کی طرف جا رہے تھے جو اس میلے کا اصل مرکز تھا۔

بشارت اور نجمہ کی زندگی میں کبھی کوئی خوشی نہیں آئی تھی۔ سیر و تفریح کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا لیکن اس مرتبہ انہوں نے میلہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور تیار ہو کر باغبانپورہ جانے کے لئے تانگے میں بیٹھ گئے۔

تانگے نے انہیں دور ہی اتار دیا تھا۔ سڑک پر بے پناہ رش تھا۔ چلنے کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ زندہ دلان لاہور ڈھول تاشے بجاتے اور مستیاں بکھیرتے ٹولیوں کی صورت میں جا رہے تھے۔ نجمہ اور بشارت ایک ایسی ہی ٹولی میں شامل ہو گئے۔ سڑک کے دونوں طرف دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ دونوں بہن بھائی یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے لیکن وہ دونوں اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ سیاہ بختی نے ان کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔

دونوں جب تانگے سے اترے تو انھیں اکیلے دیکھ کر دو غنڈے ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ان کی نظریں نجمہ پر مرکوز تھیں۔ انہوں نے نجمہ اور بشارت کو ایک لمحہ کو بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا اور سائے کی طرح ان کے پیچھے لگے رہے۔

نجمہ اور بشارت مٹھائی کی ایک دکان کے قریب رک گئے۔ بشارت نے نجمہ کو ایک طرف کھڑے رہنے کو کہا اور خود مٹھائی لینے کے لئے آگے بڑھ گیا۔ دکان پر رش تھا۔ بشارت کے قریب ہی پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک شخص مٹھائی لے رہا تھا۔ اس کے دوسری طرف بارہ تیرہ سال کی عمر کا ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ اس کی نظریں پتلون والے شخص کی پتلون کی پچھلی جیب پر جمی ہوئی تھیں جہاں سیاہ چرمی بٹوے کا ایک کونا جھانک رہا تھا۔

موقع پا کر اس لڑکے نے پتلون والے کی جیب سے بٹوا کھینچا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جھٹکا لگنے سے اس شخص کو بھی پتا چل گیا کہ اس کی جیب کٹ چکی ہے۔ عین اسی لمحے بشارت کو نجمہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے مڑا۔ ایک آدمی نجمہ کو بازو سے پکڑے زبردستی گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے جا رہا تھا۔ بشارت نجمہ کو بچانے کے لئے اس کے پیچھے بھاگا۔ ابھی وہ چند قدم بھاگا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کی گردن پکڑ لی۔

"چور..... اچکے..... حرامزادے..... جیب کاٹ کر بھاگ رہا تھا نکال میرا بٹوا....."

بشارت نے مڑ کر حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ یہ وہی پتلون والا آدمی تھا جو مٹھائی کی دکان کے سامنے اس کے قریب کھڑا تھا۔ اب وہ اس کی گردن دبوچے خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"اوئے نکال میرا بٹوا ورنہ ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔" اس شخص نے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔

"جی..... بٹوا..... میں نے تو نہیں لیا آپ کا بٹوا....." بشارت کے لہجے میں خوف بھی تھا اور حیرت بھی۔

"اوئے تُو نے میری جیب سے بٹوا نہیں نکالا.....؟ جھوٹ بولتا ہے حرامزادے..... تو پھر بھاگا کیوں تھا..... نکال میرا بٹوا نہیں تو مار مار کے کھال ادھیڑ

دوں گا۔" اس شخص نے اس کے گال پر زوردار طمانچہ جڑ دیا۔

"میں نے آپ کا بٹوا نہیں چرایا۔ میں تو اپنی باجی کو بچانے کے لئے بھاگا تھا۔ اسے غنڈے پکڑ کر لے گئے ہیں۔" بشارت نے روتے ہوئے کہا اور اس طرف اشارہ کیا جس طرف اس نے غنڈے کو نجمہ کو لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

"بکتا ہے..... جھوٹ بولتا ہے....." اس شخص نے دو تین اور تھپڑ رسید کر دیئے۔ "میں کہتا ہوں میرا بٹوا دیدے مجھے ورنہ....."

بشارت چیخنے چلانے لگا کہ اس نے بٹوا نہیں نکالا۔ بلکہ وہ تو اپنی بہن کو غنڈوں سے بچانے کے لئے بھاگا تھا۔ مگر اس کی کون سنتا۔ کئی لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ بشارت رو رو کر ایک ایک شخص کے سامنے فریاد کر رہا تھا لیکن کوئی بھی تو اس کا ہمدرد نہیں تھا۔ سب لوگ اسے جیب تراش اور اچکا کہہ رہے تھے۔

"اسے پولیس کے حوالے کر دو۔ یہ ایسے نہیں بتائے گا۔ بڑے پکے ہوتے ہیں یہ' مار کھا کر بھی کچھ نہیں بتاتے۔" مجمع میں سے ایک شخص نے کہا۔

"بھائی صاحب۔ میں سچ کہتا ہوں..... میری تلاشی لے لیں۔ میں نے بٹوا نہیں چرایا۔ میں تو اپنی بہن....."

"چٹاخ....." ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور تھپڑ مارتے ہوئے نجمہ کے ساتھ ایک ناجائز رشتہ جوڑا۔

بشارت کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر وہ شخص بھی اسے بری طرح پیٹنے لگا جس کی جیب کٹی تھی۔ اسی دوران ایک پولیس والا ٹہلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"اوئے۔ کیا بات ہے بھئی۔ اس لڑکے کو کیوں پیٹ رہے ہو؟" وہ لوگوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

"جیب کترا ہے جناب۔ اس بابو کا بٹوا پار کیا ہے۔" ایک آدمی نے کہا۔

"نہیں سنتری جی۔ میں نے ان کا بٹوا نہیں نکالا۔" بشارت نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں کہا۔

"بٹوا نہیں نکالا..... ہوں....." کانسٹیبل نے اسے گھورا اور پھر اچانک ہی اس کے سینے پر گھونسہ مار دیا۔

بشارت بلبلا اٹھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی کون سنتا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا سنتری جی..... اسے تھانے لے جاؤ۔ یہ کسی گروہ کا بندہ لگتا ہے۔" ایک آدمی نے آواز لگائی۔

پولیس والے نے بشارت کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے جانے لگا۔ وہ آدمی بھی ان کے ساتھ ہی تھا جس کی جیب کٹی تھی۔ بشارت اب بھی روتے ہوئے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا مگر پھر اس نے اچانک ہی رونا بند کر دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے اچانک ہی ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا۔ پولیس والے کو ایک زوردار دھکا دیا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

پولیس والا اس کے دھکے اور قریب سے گزرتے لوگوں کے ریلے سے ٹکرا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور منہ کے بل سڑک پر گرا۔ اس کے اگلے دو دانت ٹوٹ گئے۔ بشارت نے بھاگنے کی کوشش تو کی تھی مگر پکڑا گیا۔ اس کی وجہ سے پولیس والے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ وہ بشارت کی دھنائی کرتا ہوا اسے تھانے لے گیا۔

تھانے میں بھی اس کی ٹھیک ٹھاک تواضع کی گئی۔ اس کے خلاف باقاعدہ پرچا کٹ گیا۔ اس پر جیب تراشی کے علاوہ پولیس کانسٹیبل پر حملہ اور اسے زخمی کرنے کا الزام بھی عائد کر دیا گیا۔

اگلے روز بشارت کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے سرسری سماعت کے بعد بشارت کی چیخ و پکار کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے دو سال کے لئے بورسٹل جیل بھیج دیا۔

جیل میں پہلا قدم رکھتے ہی بشارت کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

بشارت نے بورسٹل جیل میں قدم رکھا تو اسے یہاں کا ماحول کچھ عجیب سا لگا۔ سب سے پہلے تو بڑی بڑی مونچھوں والے جیلر سے واسطہ پڑا جس نے بشارت کی فائل پڑھنے کے بعد سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہوں۔ عادی معلوم ہوتے ہو لیکن شاید پکڑے پہلی دفعہ گئے ہو۔"

"صاحب جی۔ میں نے کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ میں نے چوری نہیں کی۔ غنڈے میری بہن کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ مجھے چھوڑ دیں۔ میں اسے تلاش کروں گا۔" بشارت

نے روتے ہوئے جیلر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"اب تم الزام قبول کرو یا نہ کرو' سزا تو تمہیں ہو ہی گئی ہے۔ اب تو تمہیں دو سال اس چار دیواری کے اندر ہی بسر کرنا ہوں گے۔" جیلر نے کہا۔

"دو سال۔" بشارت کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ یہ تو اسے یہاں آ کر پتہ چلا تھا کہ اسے دو سال کی جیل ہوئی ہے۔ وہ جلدی سے بولا۔ "کیا آپ مجھے دو سال سے پہلے نہیں چھوڑ سکتے؟"

"چھوڑ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم یہاں رہ کر اچھے کردار کا مظاہرہ کرو۔" جیلر نے کہا۔

"اگر تم نے یہاں رہتے ہوئے کوئی گڑبڑ یا انتشار پھیلانے کی کوشش نہ کی اور تم اچھے لڑکوں کی طرح یہاں رہے تو ہو سکتا ہے کہ میں ایک سال بعد ہی سفارش کر کے تمہیں یہاں سے رہائی دلا دوں۔"

بشارت خاموش کھڑا تھا۔ جیلر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر ایک وارڈن کو بلا کر بشارت کو اس کے حوالے کر دیا۔

"اسے تین نمبر وارڈ میں پہنچا دو اور رحمت خان سے کہنا اسے قالین بافی کے کھاتے میں ڈال دے۔"

بشارت جیلر کے دفتر سے نکل کر جیل والے حصے میں پہنچا تو ایک عجیب صورتِ حال نظر آئی۔ اس کے ہم عمر اور اس سے چھوٹے بڑے کتنے ہی لڑکے مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ کام سے زیادہ لوگ آپس میں گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑوں میں مصروف تھے۔ کئی لڑکوں کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور جن کے لباس سلامت تھے میلے چکٹ ہو رہے تھے۔ شاید کئی دنوں سے تو کیا کئی ہفتوں سے نہیں دھلے تھے۔

ایک طرف دو لڑکے ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا وارڈن سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ جب لڑکوں کی لڑائی زور پکڑ گئی تو وارڈن ہاتھ میں پکڑا ہوا موٹا سا ڈنڈا لہراتا ہوا ان کے قریب آیا اور کچھ پوچھے بغیر دونوں پر ڈنڈے برسانا شروع کر دیئے۔ ساتھ ہی وہ پولیس کی مخصوص زبان میں ان دونوں کا شجرہ نسب بھی سناتا جا رہا تھا۔

بشارت کو جھرجھری سی آ گئی۔

قالین بافی کا شعبہ ٹین کے ایک بہت بڑے شیڈ کے نیچے قائم تھا جہاں پانچ چھ لڑکے کام میں مصروف تھے اور ایک ادھیڑ عمر شخص بے پرواہی سے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس شعبے کا انچارج رحمت خان تھا۔ وارڈن بشارت کو اس کے حوالے کر کے چلا گیا۔ رحمت خان کو وارڈن سے معلوم ہو گیا تھا کہ بشارت کس جرم میں یہاں آیا ہے۔ وہ اسے لے کر ایک طرف فرش پر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی برخوردار کب سے دھندا کر رہے ہو؟" رحمت خان نے پوچھا۔

"کون سا دھندا؟" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"واہ میرے بادشاہ..... ہم سے بھی پھڈے بازی کرو گے۔" رحمت خان نے کہا اور دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو قینچی چلانے کے انداز میں حرکت دینے لگا۔

"میں سمجھا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" بشارت نے اس کی انگلیوں کی حرکت کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"بڑا پکا ہے بھئی۔ کیڑے استاد کا شگرد ہے تو۔" رحمت خان بولا۔

"میرا تعلق کسی گروہ سے نہیں۔ نہ ہی میرا کوئی استاد ہے۔ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔

"اوئے تو ادھر سیڑ سپاٹا کرنے آیا ہے' اچھا یہ بتا کتنی رقم اڑائی تھی؟"

"میں نے تو کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ میں تو مزدوری کرتا تھا۔ انارکلی میں بچوں کے کپڑے بیچ کر اپنا اور اپنی بہن کا پیٹ پالتا تھا۔ مزدوری کر کے پیٹ پالنا نہ تو جرم ہے اور نہ کوئی گناہ۔ میں نے تو کبھی بے ایمانی بھی نہیں کی۔ میری ایمانداری کی یہ سزا ملی ہے کہ میری بہن کو غنڈے اٹھا کر لے گئے اور جب میں اسے بچانے کے لئے دوڑا تو مجھے جیب تراشی کے الزام میں پکڑ کر یہاں پہنچا دیا گیا۔" بشارت آبدیدہ ہو گیا۔ اس کی آواز رندھ گئی اور پھر اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے بیچ اپنی پوری کہانی سنا دی۔

رحمت خان' جس کی زندگی ہی اس چار دیواری کے اندر مجرموں کو دستی ہنر سکھاتے ہوئے گزری تھی۔ بڑی گہری نظروں سے بشارت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے بشارت کے چہرے پر سچائی کی داستان مکمل نظر آئی۔ رحمت خان' جس نے جیل میں آنے والوں پر کبھی رحم نہیں کھایا تھا' نہ جانے کیوں بشارت کی داستان سن کر ملول ہو گیا۔ اس کی

آنکھوں پر چھایا ہوا وہ پردہ ہٹ گیا جس میں اسے جیل آنے والا ہر لڑکا مجرم ہی نظر آتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ بشارت بے قصور ہے۔ اسے ناکردہ جرم کی سزا دی گئی تھی اور جس نے جرم کیا تھا وہ اب تک نہ جانے کتنے اور جرم کر چکا ہو گا اور آزادی سے گھوم پھر رہا ہو گا۔

"تُو فکر نہ کر پتر۔" وہ بشارت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "نیک چلنی کا ثبوت دو گے تو وقت سے پہلے باہر ہو جائیں گا تب تک دل لگا کر قالین دا کام سیکھ لے۔"

وہ دونوں ان لڑکوں کے پاس پہنچ گئے جو ایک قالین کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے۔

"شکرے۔" رحمت خان نے ایک لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ آج سے تمہارے ساتھ کم کرے گا' ٹالنے ٹوالی بات مت کرنا۔ اسے کم سکھانا ہے۔" پھر وہ بشارت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم اسی کھڈی پر رہو گے۔ اس کے کم کو توجہ اور غور سے دیکھو۔ یہ جو کچھ تمہیں بتائے اسے ذہن میں رکھنا۔"

رحمت خان کے جانے کے بعد شکرا کام چھوڑ کر بشارت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں بھئی جگڑ جگڑ (جگر) کتنا مال اڑایا تھا۔" شکرے نے کان میں اڑسا ہوا ادھ جلا سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لگاتے ہوئے بولا۔ وہ عمر میں اس سے شاید ایک دو سال بڑا ہو گا مگر اس کا انداز بالکل کسی پختہ کار آدمی جیسا تھا۔ وہ بڑی بھرپور نگاہوں سے اسے ٹٹولنے میں مصروف تھا۔ بشارت نے اسے بھی حقیقت بتا دی تو وہ بولا۔

"بھئی ہم تو پکے پکے فنکاڑ ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بڑا فخریہ ہو گیا تھا جیسے لوگوں کی جیبیں کاٹنا بہت بڑا کام ہو۔

"تم نے جیب تراشی کہاں سے سیکھی تھی؟" بشارت نے پوچھا۔

"یہیں جیل میں۔" شکرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کئی مرتبہ جیل آ چکا ہوں۔ اب تو یہ جیل اپنا گھر بن چکی ہے۔ پہلی دفعہ جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے بھی تمہاری طرح حالات سے مجبور ہو کر کسی کی جیب کاٹی تھی۔ تُو نے تو کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ تُو' تو ایویں اندر آ گیا۔ میں نے بڑا کم کیا ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اس وقت جیب تے ہتھ ماڑا جب اپنا چھوٹا ویڑ (بھائی) بیمار تھا اوڑ ہماڑے پاس دوائی کے لئے

ایک دھیلہ نہیں تھا۔ بس فیڑ میں نے ایک ہاؤ تاڑیا اور اس کی جیب سے بٹوا نکال اے جاتے اوجا ہو گیا گڑ یاڑ اسپتال پہنچا بھی نہیں تھا کہ ڑستے میں ہی پلس نے ہاتھ پا دیتا۔ فیڑ ویڑ قبرستان تے میں ادھڑ آ گیا۔" شکرے کی آواز رندھ گئی۔ اس کی نگاہیں کسی ان دیکھے نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔

"پھر..... پھر کیا ہوا؟" بشارت نے پوچھا۔ اس کی آواز میں بھی ارتعاش تھا۔

"فیڑ....." شکرے نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب میں جیل سے نکلا تو ایک پکا فنکاڑ بن گیا تھا لیکن مجھے جلدی پتہ چل گیا کہ جب تک قنون کو اپنے ہتھ میں لے کر اس کا مذاق نہ اڑایا جائے کوئی بھی جڑم کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھی قنون کو ہتھ میں لے لیا۔ قنون کے محافظوں کو اپنا پتی داڑ بنا لیا۔"

"تو پھر تم پکڑے کیسے گئے؟" بشارت نے پوچھا۔

"علاقے کا تھانیدار نیا آ گیا تھا نا۔ سوری دا آندے نال ڈبل مال مانگن لگا۔ میں وی پسوڑی پا دیتی بس اس کنجر نے پنج چھ قلماں (دفعات) لگا کر کے اندڑ کر دتا۔"

"تمہیں کتنے عرصے کی جیل ہوئی ہے؟" بشارت نے پوچھا۔

"تین سال۔" شکرے نے بے پروائی سے کہا اور سگریٹ کا آخری کش لگا کر اسے پیر کے نیچے مسل دیا۔ "اب تو صرف ڈیڑھ سال رہ گیا ہے۔ میری من تُو بھی یہی دھندہ سیکھ لے۔ ساڑی عمر عیش ہی عیش کرے گا۔"

"نہیں نہیں۔" بشارت نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا۔ "میں یہ دھندا نہیں سیکھوں گا۔ میں صحیح سلامت ہوں' تندرست ہوں' اپنے ہاتھوں سے کما سکتا ہوں۔ میں..... میں یہ دھندہ نہیں سیکھوں گا۔"

"اوہ نہیں میڑے جگڑ یہ دنیا بڑی لعنتی اے۔ بڑی مطلبی اے۔ محنت مزدوڑی میں کچھ نہیں ملتا۔" شکرے نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ میں کما کر کھاؤں گا' چوری نہیں کروں گا۔ بھیک نہیں مانگوں گا۔" بشارت کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

"شی..... خموش..... کام کی طرف دیکھو۔ استاد رحمت آ رہا ہے۔" شکرے نے دھیمے لہجے میں کہا اور سر جھکا کر کام میں مصروف ہو گیا۔

بشارت بھی اسے ہاتھ چلاتے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں دھاگوں پر تھیں' ذہن کہیں اور تھا۔ شکرے کی باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔

کیا اس دنیا میں سب ہی میری طرح ہیں۔ یہاں غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ دولت والے غریبوں کو اسی طرح کچلتے رہیں گے۔ جرم کوئی کرے۔ سزا کسی اور کو ملے۔ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ دھاندلیاں کب تک چلیں گی میں جیل سے نکل کر پڑھوں گا۔ خوب محنت کروں گا۔ میں اقبال بنوں گا اور دنیا والوں کو جینے کا سبق سکھاؤں گا۔ انہیں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاؤں گا۔

"ہاں میرے جگڑ فیڑ کی خیال اے۔"

"کیا..... کیا کہا تم نے.....؟" بشارت شکرے کی آواز سن کر چونک گیا۔ استاد رحمت خان کسی اور طرف چلا گیا تھا۔ دوسرے لڑکے بھی کام چھوڑ کر باتوں میں لگ گئے تھے۔

"میں نے کہا فیر کیا خیال ہے؟" شکرے نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرہ کے سامنے انگلیوں کو قینچی کی طرح حرکت دی۔ وہ عجیب لڑکا تھا آدھی پنجابی آدھی اردو میں نہ جانے کیسی باتیں کر رہا تھا۔

"نہیں' نہیں۔ میں تمہاری بات کسی طرح نہیں مان سکتا شکرے۔" بشارت نے کہا۔

"ابھی تمہاری سزا کے پورے دو سال پڑے ہیں۔ جب تم فیصلہ کر لو تو مجھے بتا دینا۔ میں ہتھوں ہتھ فنکار بنا دوں گا۔"

"میں تمہاری بات پر کبھی سوچنے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔ میں آئندہ زندگی میں ایک مجرم کہلوانے کے بجائے ایک اچھا آدمی کہلوانا پسند کروں گا۔ میں بڑا آدمی بنوں گا۔ اقبال بنوں گا۔" بشارت جذباتی ہو گیا۔

"اقبال.....!" شکرے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "واہ میرے جگڑ تمہارا یہ خواب کبھی نہیں پورا ہو گا۔ مجھے دیکھو' میں نے بھی کبھی ڈاکٹر اقبال بننے کا خواب دیکھا تھا اور اب تمہارے سامنے ہوں۔"

"تم چاہو تو اب بھی برے کام چھوڑ کر اچھے آدمی بن سکتے ہو۔" بشارت نے کہا۔

"اوئے غریب کبھی چنگا آدمی نہیں بن سکتا۔ وہ تو پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی برائیاں اس کے سر تھوپ دی جائیں۔ اچھائیاں تو صرف دولت مندوں کا حصہ ہیں۔ وہ گناہ کرتے ہیں تو اسے فیشن کا نام دیا جاتا ہے' چوری کرتے ہیں تو فن سمجھا جاتا ہے' غریبوں کا خون چوستے ہیں تو اسے کاروبار کے اصول بتایا جاتا ہے۔ اور ہم۔ ہم تو غریب ہیں ہی ظلم سہنے کے لئے..... ستم برداشت کرنے کے لئے....." شکرا ایک دم خاموش ہو گیا۔

بشارت بت بنا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

"بس' بس..... بس کرو شکرے۔ چپ ہو جاؤ۔" بشارت نے ہاتھ اٹھا دیا۔

"کوئی گل نہیں جگڑ۔ آج میں چپ ہو جاؤں گا گڑ کل جب یہاں سے نکلنے کے بعد اِدھڑ اُدھڑ ٹھوکریں لگیں گی۔ تمہیں سزا یافتہ سمجھ کر کوئی تمہارے قریب نہیں آئے گا فیر تمہیں میریاں گلاں یاد آئیں گی۔ اوس ویلے تم پچھتاؤ گے کہ تم نے میری بات کیوں نہ مانی۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ابھی فیصلہ کر لو۔ میں آج ہی سے تمہیں گُر سکھانا شروع کر دوں گا۔"

اس دوران جیل کا گھڑیال بجنے کی آواز سنائی دی۔

"چلو۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔" شکرے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں کھانا نہیں کھاؤں گا' بھوک نہیں ہے۔" بشارت نے کہا۔

"او خدا دے بندے۔ روٹی نہیں کھاؤ گے تو زندہ کیسے رہو گے۔ چلو' کھانا کھا لو۔ پھر کہیں بیٹھ کر ہم گل بات کریں گے۔" شکرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ لے جانے لگا۔

بشارت نے اپنے گھر میں بھی اگرچہ کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا مگر یہ کھانا تو اس قدر بدذائقہ تھا کہ وہ ایک لقمہ بھی حلق سے نہ اتار سکا۔ جبکہ شکرا اور دوسرے لڑکے بڑے مزے لے لے کر یہ بدذائقہ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد یہ پھر اپنے اڈے پر آ گئے اور شام کو چھٹی کا گھڑیال بجا تو سب لوگ کام چھوڑ کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگے۔

بشارت جب شکرے کے ساتھ کوٹھری میں داخل ہوا تو وہاں چار لڑکے اور بھی تھے۔ شکرے نے ان سب کا تعارف کرایا وہ سب اس طرح اطمینان سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے جیسے جیل کی کوٹھری میں نہیں اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے وقت گزار رہے ہوں۔ ان میں دو لڑکے صابر اور ارشد بھی شکرے ہی کی طرح جیب تراشی کے الزام میں آئے تھے۔ حمید چوری کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا اور اکبر لڑائی اور مارپیٹ کی سزا بھگت رہا تھا۔ صابر اور ارشد تو شکرے کے شاگرد بن چکے تھے اور اس جیب تراشی کے گر سیکھ رہے تھے۔

رات کے کھانے کے لئے قیدی لڑکوں کو بیرکوں سے نکال کر لنگر خانے لے جایا گیا۔ مگر بشارت اپنی کوٹھری میں بیٹھا رہا۔

شکرے نے واپس آکر گدلے سے شوربے سے بھری ہوئی رکابی کوٹھری کے ایک کونے میں رکھ دی۔ اس پر دو ادھ جلی روٹیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

"تُو نے دن کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ تمہارے لئے روٹی لے آیا ہوں۔ جب بھوک لگے گی تو یہی روٹی کھائے گا۔" شکرے نے کہا۔

وہ سب باتیں کرتے رہے۔ بشارت خاموشی سے سنتا رہا وہ لوگ ایک دوسرے سے فحش مذاق کرتے اور کبھی گندی گالیاں بھی بکنے لگتے۔

کچھ ہی دیر بعد وارڈن آگیا۔ اس نے قیدیوں کی گنتی کی اور سلاخوں والے دروازے کو تالا لگا کر چلا گیا۔ شکرا وغیرہ اس کے بعد بھی دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر ایک ایک کر کے سب لوگ نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

رات بھیگتی جا رہی تھی۔ یہ بشارت کا جیل میں پہلا دن تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنی بہن نجمہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ اسے خدشہ تھا کہ نجمہ کو بردہ فروشوں نے پکڑ لیا ہے۔ وہی بردہ فروش جن کے بارے میں ماں قصے سنا کر اسے گھر سے باہر جانے سے روکا کرتی تھی۔ یہ جانگلی لوگ بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں اور پھر ہاتھ پاؤں توڑ کر ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ اس نے بہت سے ایسے ہاتھ پیر ٹوٹے بچے داتا صاحب کے مزار پر بھیک مانگتے دیکھے تھے۔

"تو کیا نجمہ بھی..... نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ اس سے آگے نہیں

سوچ سکا۔ اس کی آنکھیں جل تھل ہونے لگیں۔ اسے یوں لگا جیسے دیواریں اور چھت اسے کاٹنے کو آ رہی ہیں۔

اچانک اسے کسی کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ اس نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ ایک لڑکا نیند میں خود کلامی کرتے ہوئے ٹھیٹ پنجابی لہجے میں کسی کو گالی دیتے ہوئے اپنے ساتھ غلط حرکت سے روک رہا تھا۔

بشارت نے غور سے اس کی بات سننے کی کوشش کی مگر اسے کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ شکرا اس کے پہلو میں بے خبر خراٹے لینے میں مصروف تھا۔ اسے جیل میں ایک ہی دن میں بھانت بھانت کے کتنے لڑکوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ ہر لڑکا خود کو بہت بڑا مجرم قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔ مگر اس کے باوجود بشارت کو شکرا اچھا لگا تھا۔ اس کا لہجہ خالصتاً لاہوریوں کا تھا۔ بالکل کھلا ڈھلا۔

وہ سوچتا رہا' دیکھتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔

بھوک سے اس کی آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں بار بار کونے میں پڑی ہوئی رکابی اور روٹیوں کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب بھوک کی شدت نے اسے بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے بار بار سر جھٹک کر بھوک کے احساس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی لیکن سامنے پڑی ہوئی روٹی اس کی ان کوششوں کو بری طرح ناکام بنا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

اب قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس کی آنتیں اینٹھ رہی تھیں۔ اس نے کوٹھری میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ شکرا وغیرہ فرش پر آڑے ترچھے پڑے سو رہے تھے۔ بشارت خاموشی سے اٹھ کر کوٹھری کے کونے میں پہنچ گیا اور وہیں بیٹھ کر روٹی کھانے لگا۔ پہلا نوالہ تو اس نے شوربے میں ڈبو کر کھایا لیکن اس کے بعد اس نے شوربے کی رکابی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور سوکھی روٹی کے نوالے حلق سے اتارنے لگا۔ اس نے بمشکل آدھی روٹی کھائی اور پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ دیوار سے ٹیک لگائی تو کمر پھوڑے کی طرح دکھنے لگی۔ وہ فرش پر لیٹ گیا اور قریب پڑا ہوا پھٹا پرانا بدبودار کمبل اوڑھ لیا۔

اس کا منہ دروازے کی طرف تھا۔ رات کے آخری لمحات بھی بیت گئے۔ اس کی نظریں جیل کی بلند فصیل کے اوپر سے ہوتی ہوئی دور مشرقی افق پر جم گئیں جہاں پو پھٹ رہی تھی اور دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔

بشارت افق پر نظریں جمائے پھیلنے والی سرخی کو دیکھ رہا تھا لیکن شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ افق پر پھیلنے والی سرخی سے زیادہ گہری سرخی اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔

☆======☆======☆

چھ مہینے گزر گئے۔

مجرمانہ ذہن رکھنے والے بچوں کی اصلاح کے لئے بنائی جانے والی یہ جیل دراصل جرائم کی تربیت گاہ کا کام دے رہی تھی۔ ایک معصوم اور پاکیزہ ذہن دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی جرم میں ملوث ہو کر سزا کاٹنے کے لئے کچھ عرصہ اس جیل کی چار دیواری میں محصور رہنے کے بعد جب باہر نکلتا ہے تو اس کے ذہن کی معصومیت اور پاکیزگی رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی جگہ دل و دماغ میں جرائم کے سینکڑوں نت نئے طریقے جگہ بنا چکے ہوتے ہیں۔

بشارت چھ مہینوں تک تو اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ وہ جیل میں رہنے والے لڑکوں سے دور ہی رہا۔ ان کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لڑکے اس سے فحش مذاق کرتے تو وہ منہ پھیر لیتا۔

لیکن تابہ کے.....؟ وہ اس گندے ماحول میں رہ کر اپنا دامن غلاظت کے ان چھینٹوں سے نہ بچا سکا جو اس بورسٹل جیل کے ہر گوشے سے اٹھ رہے تھے۔ اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی کوشش کے باوجود اس کے پیر اس دلدل میں اتر گئے۔

چوبیس گھنٹے شکرے اور ارشد وغیرہ کا ساتھ ہونے کی وجہ سے ان کی باتیں اس پر اثر کئے بغیر نہ رہیں۔ رفتہ رفتہ بشارت بھی ان کے مذاق میں شریک ہو گیا۔ وہ ان کے پروگراموں میں حصہ لینے لگا۔ شکرے کے لیکچر اس کے ذہن پر رنگ جمانے لگے۔

بشارت، شکرے کا شاگرد بن گیا۔

شکرا، ہر روز اسے جیب تراشی کے نئے نئے گُر سکھانے لگا اور بشارت بعض اوقات قیدی لڑکوں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر کے اپنے فن کا مظاہرہ بھی کرتا جس میں وہ اکثر

کامیاب رہتا۔ اگر کبھی وہ اپنے اناڑی پن کی وجہ سے پکڑا جاتا تو وہ اپنا جرم تسلیم کرنے کی بجائے الٹا اسی پر پلٹ پڑتا۔

اس روز جیل کے عملے کو تنخواہیں ملی تھیں۔ شکرے نے دور کھڑے ہوئے ایک وارڈن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لے بھئی جگراج وارڈن پر ہتھ صاف کر دے۔"

شکرے کی بات سن کر بشارت لرز اٹھا۔ اس نے شکرے کو گھور کر دیکھا۔

"کیوں مجھے مروانے کی سوچ رہے ہو۔ اگر اسے پتہ چل گیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اوہ تُو فکر نہ کرو میرے یار۔ آخر ہم نے بھی تڑے تے محنت کی ہے اور پھڑ ..... یہ تو تمہارا امتحان ہے۔ اگر اج تم کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ تم اس فن میں تاک ہو چکے ہو۔" شکرے نے کہا۔

"لیکن....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں یار۔" شکرے نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کا بٹوا تمہاری جیب میں ہونا چاہئے۔"

بشارت خاموشی سے دور کھڑے ہوئے وارڈن کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ قیدیوں کے آرام کا وقفہ تھا۔ تمام لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ بشارت کچھ دیر تک دور ہی سے جائزہ لیتا رہا۔ پھر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا وارڈن کی طرف بڑھنے لگا۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے دیکھا کہ مخالف سمت سے پانچ چھ لڑکے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ان کا رخ وارڈن کی طرف تھا۔ بشارت نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور وہ لڑکے جیسے ہی وارڈن سے کچھ فاصلے پر پہنچے۔ وہ بھی تیز رفتاری سے اپنی جگہ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ لڑکے جیسے ہی وارڈن کے قریب پہنچے بشارت نے تیزی سے راستہ کاٹا اور مخالف سمت سے آنے والے دو تین لڑکوں کو ساتھ لیتا ہوا وارڈن سے ٹکرا گیا جو بے پروائی سے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس تصادم سے وارڈن اور لڑکے زمین پر گر گئے۔ زمین پر گرتے وقت بشارت وارڈن کے اوپر تھا لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ ان سے

تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑا اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔

وارڈن نے اپنے اوپر گرے ہوئے ایک اور لڑکے کو پکڑ کر اٹھایا اور بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ اپنی مخصوص زبان میں ان کو مغلظات سے بھی نواز رہا تھا۔

بشارت اس لڑکے کو پٹتا دیکھ کر خاموشی سے وہاں سے کھسک گیا اور جب شکرے کو ایک طرف لے جا کر بشارت نے وارڈن کا بٹوا اس کے ہاتھ پر رکھا تو شکرے کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس نے جلدی سے بٹوا کھول کر دیکھا اور نوٹ نکال کر گننے لگا۔ شکرے نے نوٹ پاجامے کے نیفے میں اڑس لئے اور خالی بٹوا وہاں سے دور جا کر پھینک دیا۔

"واہ میرے شیر۔ اوہ زندہ ٹرہ تُو۔ بڑا زبردست کم دکھایا ہے بھئی۔"

شکرے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہاری تربیت ہے شکرے۔ ورنہ میرے اندر کبھی اتنی جرأت پیدا ہو سکتی تھی۔" بشارت نے جواب دیا۔

"اسے تم پڑسک تو نہیں ہوا؟" شکرے نے پوچھا۔

"ابھی تو اسے اپنی جیب سے بٹوا اڑائے جانے کا پتہ ہی نہیں چلا ہو گا لیکن جب اسے پتہ چلے گا تو وہ سلیم سے اپنا بٹوا وصول کرنے کی کوشش کرے گا۔" بشارت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر دوسرے ہی لمحہ کسی فوری خیال کے تحت اس کے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "لیکن..... افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرے جرم کی سزا کسی اور کو ملے گی۔ جبکہ وہ اس جرم کے متعلق کچھ جانتا بھی نہیں اور بے قصور ہے....."

"اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا تم کسی اور کے جرم کی سزا نہیں بھگت رہے۔ کیا یہ سارا کچھ تمہارے اپنے جرم کا نتیجہ ہے؟" شکرے کے لہجے میں تلخی تھی۔

"لیکن میرا دل نہیں مانتا یار۔" بشارت نے کہا۔

"دل سل کی گلاں چھوڑ یار بس تُو دم پکڑ لے۔" شکرا بشارت کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"نہیں، نہیں..... میں تمہارے راستے پر کبھی نہیں آؤں گا..... کبھی نہیں۔" بشارت نے کہا اور تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔

شکرا معنی خیز نگاہوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

اور پھر ٹھیک ایک گھنٹے بعد جیل میں زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ ایک طرف سے شوروغل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں دو تین لڑکوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

یہ آوازیں سن کر بشارت نے شکرے کی طرف دیکھا۔ شکرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بشارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور بائیں ہاتھ کا گوشہ مخصوص انداز میں دبا دیا۔ ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

چیخوں کی آوازیں کچھ اور بلند ہو گئیں۔ بشارت شیڈ سے نکل کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ جیل کے کمپاؤنڈ میں ایک طرف قیدی لڑکوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ ان کے وسط میں دو سنتریوں نے سلیم اور ایک لڑکے کو پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں انہیں بے تحاشہ پیٹ رہے تھے۔ سلیم کے جسم پر پڑنے والی بید کی ہر ضرب اسے چیخنے پر مجبور کر دیتی۔

ڈپٹی جیلر بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ سلیم کو پیٹنے والا وہی وارڈن تھا جس کا بٹوا غائب ہوا تھا۔ بشارت چند لمحے وہاں رکا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا ضمیر کچوکے لگا رہا تھا۔ وہ بھیڑ سے نکلا اور دوڑتا ہوا شکرے کے پاس پہنچ گیا۔

"وہ..... وہ بٹوا واپس دے دو شکرے۔" کچھ جذبات اور کچھ دوڑنے کی وجہ سے بشارت کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"کیا.....!" شکرے نے اسے گھورا۔ "کون سا بٹوا میرے یار وہ تو میں نے اسی وقت پھینک دیا تھا۔"

"تو پھر وہ رقم دے دو جو تم نے بٹوے سے نکال کر اپنے پاجامے کے نیفے میں اڑسی تھی۔" بشارت نے کہا۔

"ہوں۔" شکرے نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تو یہ بات ہے، مگر تمہیں آدھی رقم مل سکتی ہے۔"

"آدھی نہیں۔ میں پوری رقم مانگ رہا ہوں۔" بشارت نے کہا۔

"پوری رقم نہیں۔ آدھا حصہ چاہو تو بے شک لے لو۔"

شکرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے دھواں اس کے منہ پر اچھال دیا۔

بشارت خاموش کھڑا شکرے کو گھورنے لگا۔ سلیم کی چیخیں بدستور اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ شکرے کا رویہ دیکھ کر بھی اس کا دماغ بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ شکرے کا گلا گھونٹ دے لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"مجھے اپنا حصہ نہیں لینا شکرے..... پوری رقم دے دو۔ میں وارڈن کو واپس کر دوں گا۔"

"کیا.....!" شکرا اچھل پڑا۔ "یہ نہیں ہو سکتا بشارت۔ ہاتھ آیا ہوا مال واپس نہیں کیا جاتا۔"

"لیکن یہ کمینگی ہے۔ ذلالت ہے، ظلم ہے۔ میرے جرم کی سزا کسی اور کو مل رہی ہے۔ تم سلیم کی چیخیں سن رہے ہو..... رقم واپس دے دو۔ میں اسے بچانا چاہتا ہوں۔" بشارت نے تیز لہجے میں کہا۔

"رقم واپس نہیں ہو سکتی..... جانتے ہو اگر تم نے رقم واپس کر دی تو سلیم کی جان تو بچ جائے گی لیکن تم نہیں بچ سکو گے۔" شکرے نے کہا۔

"میں اپنے کیے کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ناکردہ گناہ میں مارا جائے۔ تم رقم واپس کر دو ورنہ....." بشارت نے خاموش ہو کر ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

"ورنہ.....؟" شکرے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ورنہ میں ابھی شور مچا دوں گا کہ بٹوا سلیم نے نہیں تم نے نکالا تھا اور رقم بھی تمہارے پاس موجود ہے۔" بشارت نے کہا۔

"تو یہ بات ہے۔" شکرے نے اسے گھورا۔

"ہاں۔ اور تم جانتے ہو کہ اس طرح تم سراسر گھاٹے ہی میں رہو گے۔" بشارت نے جواب دیا۔

بات معقول تھی۔ شکرا اس دھمکی سے گھبرا سا گیا تھا۔ وہ چند لمحے بشارت کو گھورتا رہا پھر پاجامے کے نیفے میں اڑسے ہوئے نوٹ نکال کر خاموشی سے بشارت کی طرف بڑھا دیئے۔ بشارت نے نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور دوڑتا ہوا شیڈ سے باہر نکل گیا۔ شکرا بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے چلا آیا تھا۔

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ اسے مت مارو۔ بٹوا ان میں سے کسی نے نہیں نکالا۔" بشارت لڑکوں کو دھکیلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا ہے اوئے..... کیا کہہ رہا ہے تُو۔" ہیڈ وارڈن نے غصیلی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھا۔

"بٹوا میں نے نکالا تھا۔ یہ دونوں بے قصور ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔" بشارت نے جواب دیا اور مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹ وارڈن کی طرف بڑھا دیئے جس کا بٹوا تھا۔ وارڈن نے جھپٹنے والے انداز میں نوٹ پکڑ کر گنے۔ رقم پوری تھی۔

"بٹوا کہاں ہے؟" اس نے کڑکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بٹوا میں نے کھڑ میں پھینک دیا تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔

سلیم اور دوسرے لڑکے کو چھوڑ دیا گیا۔ دونوں وارڈن اب بشارت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے قیدی بھی بشارت کے گرد جمع ہونے لگے۔

پھر اچانک ہی وارڈن کا گھونسہ بشارت کے جبڑے پر لگا اور وہ تیورا کر گر گیا۔ پھر تو تھپڑ۔ مکے اور ٹھڈے بشارت کے جسم پر پڑنے لگے۔ مگر بشارت کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔

جب دونوں وارڈن اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو ایک طرف کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔ ہیڈ وارڈن آگے بڑھ آیا اور بشارت کے جسم پر زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے چیخا۔

"اسے لے جا کر سترہ نمبر کوٹھی میں بند کر دو اور پرسوں صبح تک اسے کھانے کو کچھ نہ دیا جائے۔"

ایک سنتری نے بشارت کو بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے جانے لگا۔

سترہ نمبر ایک نہایت تنگ و تاریک کوٹھری تھی۔ کوٹھری کی بجائے اسے غار کہنا ہی مناسب ہو گا کیونکہ جگہ اتنی تنگ تھی کہ اس میں ایک شخص اکڑوں تو بیٹھ سکتا تھا لیکن پیر نہیں پھیلائے جا سکتے تھے۔

سنتری نے اسے غار نما کوٹھری میں دھکیل کر دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

کوٹھری میں گھور تاریکی تھی۔ کوئی روشندان اور سوراخ ایسا نہیں تھا جہاں سے روشنی کی ایک کرن بھی اندر داخل ہو سکتی۔ بشارت نے ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹول کر آگے بڑھنا چاہا لیکن وہیں گھوم کر رہ گیا۔ کوٹھری اتنی تنگ تھی کہ وہ دونوں ہاتھ پوری طرح پھیلائے بغیر آمنے سامنے کی دیواروں کو چھو سکتا تھا۔

اس نے ایک سرد آہ بھری اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا لیکن جونہی اس نے پیر پھیلانے کی کوشش کی ایک مرتبہ پھر اس کے منہ سے آہ نکل گئی اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ پیر پھیلا سکتا۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا اور جب اس طرح بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ یوں کھڑے کھڑے بھی اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔ وہ پھر بیٹھ گیا لیکن کچھ دیر بعد اسے پھر اٹھ جانا پڑا۔

پانچ چھ گھنٹے گزر گئے۔ وہ کبھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور جب کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑ جاتیں تو بیٹھ جاتا۔ تھکن سے اس کی بری حالت ہو رہی تھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک حصہ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور لحہ بہ لحہ یہ تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ بورسٹل جیل میں اس جیسے نو عمر قیدی کو ایسی سزا ظلم و بربریت کی انتہا تھی۔ اسے یہ سزا سچ بولنے پر ملی تھی لیکن اس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ اس کا دل پُرسکون تھا اور اس کا ضمیر مطمئن تھا۔

ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تکلیف اسے مارے دے رہی تھی اور اب تو گھٹن کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔ اس تنگ و تاریک کوٹھری میں ہوا کی آمدورفت کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس کا جسم پسینے میں تر ہونے لگا۔

وہ ایک بار پھر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ قوت مدافعت کمزور پڑنے لگی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی تکلیف سے اس کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہونے لگیں اور یہ کراہیں بتدریج گھٹی گھٹی سسکیوں میں بدلتی گئیں۔

دس گھنٹے گزر گئے۔ اذیت حد سے بڑھ گئی تھی۔ اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ اٹھ کر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چلاتا بھی جا رہا تھا۔

آدھے گھنٹے تک وہ مسلسل دروازہ پیٹتا اور چیختا چلاتا رہا۔ آخر کار دروازے کے باہر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی جو دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔

بشارت بدستور دروازہ پیٹتا اور چیختا رہا۔ تالے میں چابی گھمانے کی آواز سنائی دی تو اس کے ہاتھ رک گئے اور وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

باہر سے کسی نے زوردار جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ بشارت دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ باہر کی طرف گرا۔

اس اذیت نے اسے بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو سنبھال سکتا۔ باہر کی تازہ ہوا میں وہ زمین پر پڑے پڑے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو جا رہی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر سُو گہری تاریکی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اعضا ڈھیلے پڑ گئے۔ جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ وہ ادھ موا سا ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی کی دبیز چادر پھیلتی چلی گئی۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا سر ایک جھٹکے سے سامنے کھڑے ہوئے وارڈن کے قدموں پر ڈھلک گیا۔

بشارت بے ہوش ہو گیا تھا۔

بشارت کے قریب کھڑے ہوئے وارڈن نے اپنے ساتھی کی مدد سے بے ہوش بشارت کو اٹھایا۔ وہ اسے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے لے گئے اور اس کی کوٹھری میں ڈال کر چلے گئے۔

☆=====☆=====☆

بشارت رات بھر بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ صبح جب ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو شکرے کو اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا۔ اس کے بدن کا ایک ایک عضو پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

"آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں آڈام کی ضرورت ہے۔" شکرے نے اس پر مزید جھکتے ہوئے کہا۔

"آرام۔" بشارت کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ "ہم جیسے لوگوں کی زندگی میں آرام نامی کسی چیز کا گزر نہیں شکرے۔"

"تو دیکھ لیا تم نے اپنی شرافت اور دیانت کا انجام۔" شکرے کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہاں۔ لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جرم کیا تھا مجھے اس کی سزا ملی۔ بلکہ مجھے تو..... اس بات کی خوشی ہے کہ میرے جرم کی سزا کسی دوسرے کو نہیں ملی۔" بشارت نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

"اونہہ۔" شکرا چڑ گیا۔ "ڈسی جل گئی بل نہ گیا۔ تمہاری یہ شرافت اور دیانت' ایک دن تمہیں لے ڈوبے گی۔ اچھا خیر..... میں نے صبح سے تمہارے لئے چائے رکھی ہوئی ہے۔ لو پی لو۔" شکرے نے اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا تو بری طرح چونک گیا۔ "اوہ۔ تمہیں تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ لو۔ پہلے چائے پی لو۔ پھر میں جیل کے ڈاکٹر سے تمہارے لئے دوائی شوائی لاتا ہوں۔" اس نے سہارا دے کر بشارت کو بٹھا دیا اور صبح سے ایلومینیم کے گلاس میں رکھی ہوئی ٹھنڈی اور کسیلی چائے اسے پلانے لگا۔

بشارت کو لٹا کر شکرا کوٹھری سے نکل کر دوڑتا ہوا ایک وارڈن کے پاس پہنچ گیا اور اسے بشارت کے بارے میں بتانے لگا۔

"ڈاکٹر تو آج چھٹی پر ہے۔ ڈپٹی صاحب سے بولو۔ شاید وہ کوئی بندوبست کر دیں۔" وارڈن نے کہا۔

شکرا ڈپٹی جیلر کے کمرے میں گھس گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟" ڈپٹی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں فرعونیت تھی۔

"ڈپٹی صاحب۔ بشارت کو بڑا تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر آج نہیں آیا۔ بشارت کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اسے اسپتال بھجوا دیجئے۔" شکرا ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

"بخار ہے تو میں کیا کروں۔ یہاں سب ہی لوگ کام سے بچنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔" ڈپٹی کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

"وہ مر جائے گا ڈپٹی صاحب۔" شکرا گھگیایا۔

"چل اوئے دفع ہو' جیلوں میں قیدی روز ہی مرتے رہتے ہیں۔" ڈپٹی نے کہا۔

ڈپٹی کی فرعونیت دیکھ کر شکرے کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ ڈپٹی کے کمرے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بشارت کے پاس پہنچ گیا۔

بشارت آنکھیں بند کئے لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ شکرے کے قدموں کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف تکنے لگا۔

"ڈاکٹر آج نہیں آیا اور ڈپٹی نے تمہیں اسپتال بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔" شکرے نے دھیمی آواز میں کہا۔

بشارت نے کچھ کہنا چاہا مگر نقاہت کے باعث اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

شکرا اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسی دوران ایک سنتری دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اس نے شکرے کو وہاں دیکھا تو اندر آ گیا۔

"اوئے شکرے۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔" سنتری نے اسے گھورا۔

"سنتری جی۔ بشارت کو بڑا تیز بخار ہے۔ میں اس کی دیکھ بھال کے لئے یہاں بیٹھا ہوں۔" شکرے نے جواب دیا۔

"میں پوچھتا ہوں تم اپنا کام چھوڑ کر یہاں کیوں آئے۔" سنتری دھاڑا۔

"سنتری جی....."

"چل اٹھ اوئے حرام کے جنے۔ باپ کا مال سمجھ کر مفت کی روٹیاں توڑتے ہو۔ حرامی....." سنتری نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر مار دی۔

ٹھوکر کھا شکرا' بشارت کے اوپر گرا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسری ٹھوکر پڑی۔

"اگر دو منٹ کے اندر اندر تم اپنے کھاتے میں نہ پہنچے تو کھال ادھیڑ دوں گا۔" سنتری تیسری ٹھوکر رسید کرتے ہوئے دھاڑا۔

شکرے نے بے بسی سے بشارت کی طرف دیکھا اور اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ بشارت کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ سنتری اب اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اچھی طرح سن لو۔ کل سے تمہیں بھی کام پر جانا ہو گا۔ سرکار نے تمہیں مہمان بنا کر یہاں نہیں بھیجا۔"

سنتری گالیاں بکتا ہوا چلا گیا۔ بشارت کتنی ہی دیر تک خاموش لیٹا آنسو بہاتا رہا..... بے بسی کے آنسو..... اور پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

چار روز تک بشارت بخار میں پھنکتا رہا۔ پانچویں روز اس کا بخار قدرے ہلکا ہوا تو اسے زبردستی کام پر لگا دیا گیا۔

چند روز اور گزر گئے۔ اور جب اس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تو سب سے پہلے اس نے ڈپٹی سے کہہ کر اپنی کوٹھری تبدیل کر لی کیونکہ شکرے نے ایک مرتبہ پھر اسے ورغلانا شروع کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا بیشتر وقت شکرے کے قریب رہ کر ہی گزرتا تھا کیونکہ دن میں تو شکرے کے ساتھ کام کرنا ہی پڑتا تھا اور شکرا وقت بے وقت زبردستی اس کے کانوں میں اپنی باتیں ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہتا۔

آخر ایک بار پھر شکرے کی باتیں اس کے دل پر اثر کرنے لگیں لیکن اس مرتبہ وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ ایکبار پھر ڈپٹی کے سامنے پیش ہو گیا اور قالین بافی کے کھاتے سے بڑھئی کھاتے میں چلا گیا۔

یہاں چند روز سکون سے گزرے لیکن پھر یہاں بھی وہی چکر شروع ہو گیا۔ اگر یہاں شکرا نہیں تھا تو کیا ہوا۔ اس کے کردار کے حامل اور بھی تو کتنے ہی شکرے موجود تھے اس جیل میں۔

ایک روز صبح ہی صبح بشارت بڑھئی کھاتے میں پہنچا تو چند ہی منٹ بعد شکرا بھی وہاں آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"اچھا بھئی جگڑ اج اپنی ڈنھتی ہے یہاں سے۔ آج میں رہا ہو رہا ہوں بشارت۔" وہ بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے شکرے کہ آج تمہیں آزادی مل رہی ہے۔" بشارت خوشی کا اظہار کیا۔

"اوئے اپنے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہو سکتا ہے چند روز باہر گزارنے کے بعد پھر آ جاؤں۔" شکرے نے جواب دیا۔

"نہیں، نہیں۔ ایسا مت کہو شکرے۔ تم جوان ہو، صحت مند اور طاقتور ہو۔ تم تو قالین بافی کا کام بھی جانتے ہو۔ کہیں نوکری کر لینا۔" بشارت نے کہا۔

"نوکری۔ اونہہ۔" شکرے کے لہجے میں طنز تھا۔ "جو شخص ایک مرتبہ جیل کی ہوا کھا جائے اس کے لئے شرافت اور عزت سے روٹی کمانے کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔"

"نوکری نہ ملے تو مزدوری کر لینا۔ تم بوجھ اٹھا سکتے ہو۔"

"سزا یافتہ کو مزدوری بھی نہیں ملتی۔ جب تم ان اونچی دیواروں سے باہر نکلو گے تو تمہیں بھی یہ تجربہ ہو جائے گا۔" شکرے نے کہا اور پھر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ "اچھا..... اب میں چلتا ہوں۔ باہر آ کر مجھ سے ضرور ملنا۔ میکلوڈ روڈ کے لکشمی چوک پر کسی سے بھی استاد گنگو کا اڈہ پوچھ لینا۔"

"نہیں شکرے۔" بشارت نے جواب دیا۔ "مجھ سے ایسی امید نہ رکھنا کہ میں یہاں سے نکلنے کے بعد کبھی تم سے ملنے آؤں گا۔"

لیکن شکرے نے اس کی بات ان سنی کر دی۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا جگڑ تو نہ آیا تو ویلا (وقت) تجھے میرے پاس آنے پر مجبور کر دے گا۔ اچھا۔ ڈب ڈاکھا۔" شکرے نے ایک بار پھر گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گیا۔

شکرے کے جانے کے بعد بشارت کتنی دیر تک اس کے الفاظ پر غور کرتا رہا۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں اپنے آپ کو وقت کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بننے دوں گا۔ میں شکرے کا انتظار کبھی ختم نہیں ہونے دوں گا۔ وہ..... وہ میرا انتظار کرتا رہے گا اور یہ کبھی ختم نہیں ہو گا۔"

چھ مہینے اور گزر گئے۔

اس روز صبح ہی صبح جب وہ اپنے کام پر پہنچا تو ایک وارڈن بڑھئی کھاتے میں داخل ہوا۔

"بشارت علی۔ تمہیں ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں۔"

چند منٹ بعد ہی بشارت ڈپٹی صاحب کی پیشی میں حاضر تھا۔ اور جب ڈپٹی نے اسے

یہ بتایا کہ آج اسے رہا کیا جا رہا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔

"مجھے امید ہے کہ تم اپنی آئندہ زندگی میں ایک شریف شہری بننے کی کوشش کرو گے اور کبھی ایسا کام نہیں کرو گے جس سے تمہیں پھر اس چار دیواری کے اندر آنا پڑے۔"

"ڈپٹی صاحب! میں نے تو پہلے بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ تقدیر ہی تھی جو مجھے یہاں کھینچ لائی۔ اگر وہ لوگ مجھے پکڑ نہ لیتے تو شاید میں اپنی باجی کو غنڈوں کے چنگل سے بچا لیتا۔" بشارت نے گلوگرفتہ سے لہجے میں جواب دیا۔

"بہرحال!" ڈپٹی اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "اب تم آزاد ہو اور ماشاء اللہ جوان بھی ہو۔ کہیں نوکری کر لینا اور اپنی بہن کی تلاش بھی جاری رکھنا۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

بشارت ڈپٹی جیلر کو سلام کر کے وارڈن کے ساتھ دفتر سے باہر آ گیا۔ چند منٹ بعد جیل کے گیٹ سے باہر قدم رکھتے ہوئے اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ آزادی کا فرحت بخش احساس۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ پلٹ کر جیل کے بلند آہنی گیٹ اور اونچی فصیل کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف کو چل پڑا۔

ایک نئی منزل کی تلاش میں۔

☆=====☆=====☆

دو سال جیل کی اونچی دیواروں کے پیچھے رہنے کے بعد بشارت جب آزاد اور کھلی فضا میں آیا تو اسے سب کچھ عجیب سا لگا۔ لاہور کے بازار اور گلیاں کوچے اسے انجانے اور اجنبی سے لگ رہے تھے۔ اس کی حالت اس پینڈو جیسی تھی جو پہلی دفعہ شہر آیا ہو اور ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہا ہو۔

آزادی کی نوید سناتے ہوئے ڈپٹی جیلر نے اسے تھوڑی سی رقم دے دی تھی جو اس نے بڑی احتیاط سے قمیص کی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ دور تک پیدل چلتا رہا اور پھر ایک تانگے پر بیٹھ کر بھاٹی پہنچ گیا۔ وہاں سے لاری اڈے کی طرف جانے والے دوسرے تانگے پر بیٹھا اور ٹکسالی گیٹ کے سامنے اتر گیا۔ رش میں سڑک پار کرنے میں اسے دو

منٹ لگے۔

سب کچھ وہی تھا۔ ان دو برسوں میں یہاں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن بشارت کو ہر چیز انجان سی لگ رہی تھی۔ اجنبیت سی ٹپک رہی تھی۔ وہ ٹکسالی گیٹ کے اندر سڑک پر چلتا ہوا اس کشادہ گلی کے موڑ پر رک گیا جس کی ایک نکڑ پر چاچا حاکم علی کی دودھ دہی کی دکان تھی اور دوسری طرف بینڈ باجے والے کی دکان تھی۔ دونوں دکانیں اب بھی اپنی اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ چاچا حاکم علی اس وقت بھی سر پر بڑا سا پگڑ باندھے دودھ سے بھری ہوئی کڑاہی کے پیچھے ایک اونچی چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف بینڈ باجے والے کی دکان بھی جوں کی توں تھی۔ اندر دیواروں پر بڑے بڑے فلمی پوسٹر لگے ہوئے تھے جن پر بڑے بڑے بگل اور بینڈ میں استعمال ہونے والے دیگر ساز ٹنگے ہوئے تھے۔ دو آدمی فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھے بڑے بھدے سُروں میں کوئی فلمی دھن بجانے کی ریہرسل کر رہے تھے۔

اس کشادہ گلی کے دونوں طرف دکانیں تھیں اور آگے جا کر دائیں بائیں کئی تنگ سی گلیاں پھوٹتی تھیں۔ بشارت بائیں طرف مڑ گیا اور کئی تنگ اور گندی گلیوں میں گھومتا ہوا ایک گلی کے موڑ پر بجلی کے ایک کھمبے کے قریب رک گیا۔ بجلی کا یہ پول دیکھ کر اسے وہ لمحات یاد آ گئے جب وہ رات کو اس پول پر جلنے والے بلب کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ وہ بے اختیار پول سے لپٹ گیا۔ اسے عجیب سا سکون ملا۔

گلی میں داخل ہو کر وہ اپنے مکان کے سامنے پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ شاید غلط جگہ پر آ گیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نہیں یہ وہی جگہ تھی۔ مگر اس کا یہ مکان۔ اس کی دیواریں نہ تو ٹوٹی پھوٹی تھیں نہ بے رنگ۔ دیواروں پر بڑی صفائی سے پلستر کیا گیا تھا جس پر آف وائٹ ڈسٹمپر تھا۔ دروازہ بھی نیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر الجھی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہی گلی تھی' سامنے وہی ملک صاحب کا مکان تھا۔ یہ مکان بھی وہی تھا مگر اس کی مرمت اور رنگ و روغن کس نے کروا دیا ہے؟

انہی خیالوں میں کھوئے ہوئے بشارت نے دھکا دے کر دروازہ کھولنا چاہا مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ پٹ تھپتھپانے لگا۔ چند لمحوں بعد اندر سے زنجیر گرنے کی آواز سنائی دی اور ایک پٹ تھوڑا سا کھل گیا۔ بشارت بے صبری سے دروازے کو دھکیل کر اندر

داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی۔ جو عجیب سی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"نجمہ باجی.....!" بشارت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ بانہیں پھیلا کر آگے بڑھا لیکن دوسرے ہی لمحہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ نوجوان لڑکی اس کی نجمہ باجی تو نہیں تھی۔ بشارت نے غور سے دیکھا۔ وہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی جو اس کے لئے قطعی اجنبی تھی۔

لڑکی بھی ایک اجنبی نوجوان اس طرح اندر گھستے دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔ وہ بدحواس سی ہو کر تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور پھر اچانک ہی بشارت کے منہ سے نکلنے والے "نجمہ باجی" کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج گئے۔

"کون نجمہ باجی..... کون ایں توں۔" لڑکی نے اسے گھورا۔

"جی۔ میری بہن نجمہ..... میں بشارت ہوں۔ ہم لوگ یہیں رہتے تھے۔ اسی گھر میں۔" بشارت نے رک رک کر کہا۔

"اوہ!" لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ایک کمرے سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"کون ہے غزالہ پتر۔ کس سے باتیں کر رہی ہو؟"

"پتہ نہیں کون اے ابا۔" لڑکی نے اندر کی طرف منہ کر کے کہا۔ پھر بشارت سے مخاطب ہو کر بولی۔ "آپ باہر ٹھہریئے۔ میں ابے کو بھیجتی ہوں۔"

بشارت کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اسے اپنے ہی مکان میں داخل ہونے سے روک کر باہر ٹھہرنے کو کہا جا رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے غزالہ نامی اس لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر دروازے سے باہر ٹھہر گیا۔ غزالہ دروازہ بھیڑ کر اندر چلی گئی۔

پانچ منٹ کے انتظار کے بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر آیا۔ چند لمحوں تک بشارت کو اوپر سے نیچے تک گھورتا رہا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے۔ کس سے ملنا ہے پتر۔"

"جی وہ....." بشارت کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ کیا کہے اور کس طرح کہے۔

"ہاں ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو لیکن یہ سن لو کہ اگر تم کسی یتیم خانے یا ایسے ہی کسی خیراتی ادارے کے لئے چندہ مانگنے آئے ہو تو میرا وقت ضائع مت کرو۔" وہ شخص

ایک بار پھر اسے اوپر سے نیچے دیکھنے لگا۔

بشارت کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس کی حالت تو واقعی یتیم خانے کا چندہ مانگنے والوں جیسی تھی۔

"جی' میں نہ کسی یتیم خانے کا نمائندہ ہوں اور نہ ہی کسی اور خیراتی ادارے کے نام پر چندہ جمع کر رہا ہوں۔ میں تو....." بشارت کہتے کہتے پھر رک گیا۔

"اوہ فیر تینوں کی چاہیدا۔" اس شخص نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مکان میں کب سے اور کس کی اجازت سے رہ رہے ہیں؟" بشارت نے کہا۔

"کی مطلب اے ترا۔ اوئے توں کون ہوتا ہے پوچھنے والا۔" اس مرتبہ اس شخص کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میں اس مکان کا مالک ہوں اور مجھے آپ سے پوچھنے کا حق حاصل ہے۔" بشارت نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اس مکان کے مالک تم تھے یا کوئی اور لیکن اب اس کا مالک میں ہوں۔ یہ مکان میں نے مول لیا ہے۔"

"مگر میں نے تو یہ مکان نہیں بیچا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں دو سال بعد یہاں آیا ہوں اور اس دوران آپ مالک بن گئے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جانتا ہوں تم آج سے دو سال پہلے جیب تراشی اور مارپیٹ کے جرم میں جیل گئے تھے اور یہ مکان تمہارے پیو نے اپنی زندگی میں ہی کسی کے پاس سات ہزار روپے میں گروی رکھا ہوا تھا اور وہ وقت پر قرضہ ادا نہ کر سکا اس طرح وہ اس مکان کی ملکیت سے محروم ہو گیا۔"

بشارت کا دماغ گھوم گیا۔ اسے اس کے ماں باپ نے کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ مکان گروی رکھا ہوا ہے۔

ویسے یہ حقیقت تھی کہ آج سے بارہ سال پہلے علی خان جب بیمار ہوا تھا تو اس نے حالات سے تنگ آ کر گھر کی ہر چیز فروخت کرنے کے بعد یہ مکان بھی ایک ساہوکار کے پاس پانچ ہزار روپے میں گروی رکھ دیا تھا اور بعد میں دو ہزار روپے اور بھی لئے تھے اور

ان میں یہ طے پایا تھا کہ علی خان اگر مقررہ مدت میں قرض ادا نہ کر سکا تو ساہوکار اس مکان کو فروخت کر کے اپنا قرضہ مع سود کے وصول کرے گا اور باقی رقم اسے ادا کر دے گا۔ بے چارہ علی خان طویل بیماری کے دوران قرضہ ادا نہ کر سکا اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

"شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں لیکن یہ حقیقت ہے۔ میں نے اپنا اطمینان کرنے کے بعد ہی یہ مکان خریدا تھا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں کاغذات دکھا سکتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ مجھے کاغذات دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے اس ساہوکار کا نام اور پتا بتا دیں جس سے آپ نے مکان خریدا تھا۔" بشارت نے کہا۔

"چوہدری عمر۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "سود کا کاروبار کرتا ہے۔ غریبوں کا خون چوس کر بڑی دولت جمع کر رکھی ہے۔ شاہ عالمی میں اس کا دفتر ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "یہ مکان میں نے تین لاکھ میں خریدا تھا اور تمہارے باپ نے اس سے غالباً سات ہزار روپے قرض لئے تھے۔ اگر وہ سود ملا کر بھی رقم کاٹے تو تمہاری بہت سی رقم بچتی ہے۔ تم یہ رقم قانونی طور پر بھی اس سے وصول کر سکتے ہو۔"

بشارت نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا۔ مکان کے در و دیوار پر الوداعی نظر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی میں مڑ گیا۔

شاہ عالمی میں چوہدری عمر کا دفتر بہت شاندار تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ قیمتی اور آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایک صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے ہی شیشے کے ٹاپ والی آفس ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر قیمتی لباس پہنے ایک موٹا سا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی دو دو انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔

بشارت کو اس طرح اندر آتے دیکھ کر وہ تینوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چوہدری عمر گھورتی ہوئی نظروں سے بشارت کے سروپا کا جائزہ لے رہا تھا۔

تنگ سی پتلون..... پائنچے ٹخنوں سے اوپر۔ قمیص کا گریبان کھلا ہوا ..... اوپر کو رول کئے ہوئے آستین۔

"کیا بات ہے۔ کون ایں توں؟" چوہدری عمر نے اسے گھورا۔

"میں علی بھائی کا بیٹا بشارت علی ہوں۔ اپنے مکان کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" بشارت نے جواب دیا۔

"کون علی خان؟" چوہدری عمر کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

"میرا خیال ہے آپ کو علی خان کا نام اتنی جلد فراموش نہیں کر دینا چاہئے۔ اگر بھول بھی گئے ہیں تو میں یاد دلا دیتا ہوں۔" بشارت نے کہا اور پھر اسے مکان کے بارے میں بتانے لگا۔

"اوہ۔ اچھا۔" چوہدری عمر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تم شاید نہیں جانتے کہ میرے اور تیرے پیو کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی رُو سے مقررہ مدت کے اندر مکان نہ چھڑا سکنے کی صورت میں مکان فروخت کر کے میں اپنے قرضے کی رقم مع سود کے وصول کر سکتا تھا اور....."

"ایسی صورت میں بھی آپ باقی رقم ورثاء کو ادا کرنے کے پابند تھے۔" بشارت نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بالکل۔" چوہدری نے سر ہلایا۔ "لیکن صورت حال یہ ہے کہ علی خان کے انتقال کے چند مہینے پہلے ہی معاہدہ کی مدت پوری ہو گئی تھی۔ میں اگر چاہتا تو اس وقت مکان نیلام کروا دیتا۔ مجھے عدالت سے ڈگری مل جاتی لیکن علی خان کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے ایسا نہیں کیا اور اس کے انتقال کے بعد مجھے تم دونوں بہن بھائیوں پر ترس آ گیا۔ میں نے یتیم اور لاوارث بچوں کو بے گھر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مجھے مجبوراً وہ قدم اٹھانا پڑا۔ میں نے اپنی رقم وصول کرنے کے لئے مکان فروخت کر دیا۔"

"آپ نے وہ مکان تین لاکھ میں فروخت کیا تھا۔ اپنی رقم کاٹنے کے بعد باقی رقم؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جس روز میں نے عدالت سے ڈگری حاصل کی تھی اس روز تک انٹریسٹ ملا کر رقم پوری ہو گئی تھی بلکہ میری کچھ رقم علی خان کی طرف نکلتی تھی لیکن وہ میں نے معاف کر دی۔" چوہدری عمر نے کہا۔

"لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔" بشارت نے کہا۔ "معاہدے کی مدت

میرے باپ کی زندگی میں پوری ہو گئی تھی لیکن تم نے اس وقت عدالت سے ڈگری حاصل کرنے کی بجائے چھ سات سال مزید انتظار کیا تاکہ مکان پر مکمل قبضہ کر سکو لیکن سیٹھ عمر....." وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ باقی رقم واپس کر دو ورنہ ..... میں رقم تو وصول کر ہی لوں گا اور تمہارا جینا بھی حرام کر دوں گا۔"

"دھمکی دے رہے ہو۔ وہ بھی چوہدری عمر دین کو۔" چوہدری دہاڑا۔ "میں نے تمہارا کوئی پیسہ نہیں دینا۔ مکان قانونی طور پر نیلام ہوا ہے۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر زیادہ ہی شوق ہے تو جاؤ عدالتیں کھلی ہیں۔ جو چاہو کر لینا۔"

"قانون اور عدالتیں۔" بشارت نے چڑ کر کہا۔ "تم سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے میں نہ تو قانون کا سہارا لوں گا اور نہ ہی کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ میں تم سے بھیک نہیں مانگ رہا۔ اپنا حق مانگ رہا ہوں اور میں اپنا حق ضرور وصول کروں گا۔"

"چل اوئے نٹا کھا یہاں سے۔" چوہدری نے چیختے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"نکل جاؤں گا لیکن ..... یاد رکھو چوہدری۔ میرا حق تم ہضم نہیں کر سکو گے۔" بشارت نے میز پر مکا مار کر کہا اور مڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ ایک بار پھر سڑکوں پر پھرنے لگا۔

وہ کشمیری بازار سے ہوتا ہوا دلی دروازے کی طرف نکل آیا۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ دوپہر کو ایک ٹھیلے سے حلیم اور کلچہ کھا کر اس نے پیٹ کی آگ بجھائی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ چوہدری عمر والا معاملہ تو اس نے فی الحال پس پشت ڈال دیا۔ اس وقت تو اسے کسی کام دھندے کی فکر تھی۔ اس کی جیب میں ساٹھ ستر روپے ہی تھے اور وہ جانتا تھا کہ بہت زیادہ کفایت شعاری سے بھی کام لے گا تو یہ رقم دو تین دن سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ وہ کام کی تلاش میں شام تک ٹھوکریں کھاتا رہا لیکن کہیں بھی کام یا مزدوری نہیں ملی۔

رات بسر کرنے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچ گیا اور ایک

مناسب سی جگہ دیکھ کر لیٹ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی، لیٹتے ہی سو گیا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے جھنجوڑ کر اسے جگا دیا۔

"اوئے نواب دے پوتے۔ کھسکو یہاں سے۔ یہ میری جگہ ہے۔" بشارت کے سامنے کھڑے ہوئے ایک ہٹے کٹے بھکاری نے خونخوار لہجے میں کہا۔ "ابے اٹھتے ہو یا میں اٹھا کر پھینک دوں۔ جگہ دا کرایہ ہم دیں اور آرام تُو کر رہا ہے۔"

بھکاری کے تیور دیکھ کر بشارت نے وہاں سے اٹھ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ اٹھ کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ تھرڈ کلاس کے اس وسیع مسافر خانے میں اسے کہیں بھی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں وہ لیٹ سکتا۔ مسافر خانے کی ایک ایک انچ زمین پر دن بھر بازاروں میں لولے لنگڑے اور پاپج بن کر بھیک مانگنے والے ہٹے کٹے اور قابل رشک صحت کے مالک بھکاریوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔

بشارت کو سیڑھیوں کے نیچے کچھ خالی جگہ نظر آ گئی اور وہ ایک بھکاری کے قریب ہی لیٹ گیا لیکن ابھی آنکھیں پوری طرح بند نہیں ہوئی تھیں کہ ایک پولیس والا ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لئے اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"اوئے۔ کون ہو تم؟" کانسٹیبل اسے ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔ "وارداتے لگتے ہو۔" پولیس والا خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"جی نہیں۔ مسافر ہوں۔ صرف رات گزارنا چاہتا ہوں۔" بشارت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو۔" کانسٹیبل غرایا۔ "لیکن خیر۔ یہاں رات گزارنے کا کرایہ جانتے ہو۔"

"لیکن یہ تو ریلوے کا مسافر خانہ ہے۔ مسافروں کی سہولت کے لئے....."

"مسافروں کی سہولت کے لئے ہے، تم جیسے لفنگوں کے لئے نہیں۔ رات گزارنی ہے تو پانچ روپے نکالو۔ ورنہ ایک سو نو میں پکڑ کر بند کر دوں گا۔" کانسٹیبل نے کہا۔

بشارت نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جیب سے پانچ کا نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کچھ دیر کانسٹیبل کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ایک گہرا سانس لیتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور جلد ہی سو گیا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو مسافر خانہ آدھے سے زیادہ خالی ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں کچھ لوگ ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ قریب ہی بھنگی مسافر خانے کے فرش پر جھاڑو لگا رہا تھا۔ خاک اڑ کر بشارت پر آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے وہاں سے اٹھا اور نل سے منہ ہاتھ دھو کر اسٹال سے چائے کا ایک کپ پیا اور مسافر خانے سے باہر نکل گیا۔

پورا دن سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے گزر گیا۔ اسے کہیں مزدوری وغیرہ بھی نہ ملی۔ وہ جہاں بھی گیا لوگوں نے اس کا حلیہ دیکھ کر اسے دور ہی سے دھتکار دیا۔

تین چار دن گزر گئے۔ بشارت کام کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ اب اس کے پاس آٹھ دس روپے ہی رہ گئے تھے۔

"شام تک یہ بھی خرچ ہو جائیں گے۔ پھر کیا کروں گا؟" بشارت نے سوچا۔ وہ حالات سے تنگ آ چکا تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور کام کی تلاش جاری رکھی۔ جب شام تک بھی کوئی کام نہ ملا تو وہ نڈھال سا ہو کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

"کیا شکرے کا کہنا ٹھیک تھا کہ میں شرافت اور دیانتداری سے روٹی کما کر بھی نہیں کھا سکوں گا۔ کیا مجھے شکرے کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا پڑے گا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لوگوں کی جیبیں کاٹنی پڑیں گی۔ چوری کرنی پڑے گی؟ نہیں..... نہیں..... نہیں..... بھوکا مر جاؤں گا مگر یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔"

بشارت کی جیب میں اب پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ اب وہ ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بھی نہیں سو سکتا تھا۔ اس کے پاس تو کھانے کے لئے پیسے نہیں تھے پولیس والے کو پانچ روپے کہاں سے دیتا۔ وہ رات اس نے ایک پارک میں گزاری۔ صبح اٹھ کر اس نے نل سے منہ ہاتھ دھویا' پیٹ بھر کر پانی پیا اور ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ دوپہر ہو گئی۔ بھوک اور تھکن سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور جستجو جاری رکھی۔ آخر کار تقدیر کو اس پر رحم آ ہی گیا۔

ایبٹ روڈ پر فٹ پاتھ پر سائبان میں بنے ہوئے چائے کے ایک چھوٹے سے ہوٹل "دربار مغلیہ" کے پشاوری مالک نے اس پر ترس کھا کر اسے دو وقت کی روٹی پر ملازم رکھ لیا اور رات کو سونے کی جگہ بھی دے دی۔

پندرہ روز گزر گئے۔ اسے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو تین گھنٹوں کی چھٹی ملتی اور

ان دو تین گھنٹوں کے دوران وہ نجمہ کو تلاش کرنے کے لئے نکل جاتا۔

وہ سڑکوں پر آنے جانے والے ہر شخص کو غور سے دیکھتا اور پہچاننے کی کوشش کرتا۔ وہ اس غنڈے کی شکل ابھی تک نہیں بھولا تھا جو میلے والے دن نجمہ کو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے گیا تھا مگر اسے کہیں بھی ایسا کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیا۔

دربار مغلیہ' ہوٹل میں زیادہ تر مزدور اور نچلے طبقے کے لوگ ہی کھانا کھانے کے لئے آتے تھے یا پھر وہ لوگ چائے وغیرہ پینے آ جاتے جو آس پاس کے سینماؤں میں فلم دیکھنے کے لئے آتے تھے۔

ایک روز بشارت ایک میز پر جھکا ایک ہاتھ میں خالی کپ اٹھائے دوسرے ہاتھ میں میلی سی صافی سے میز صاف کر رہا تھا کہ اپنے پیچھے ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔

"اوئے لڑکے۔ دو چائے لاؤ۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ ملائی والی۔"

یہ آواز میں نے کہاں سنی تھی..... کس کی آواز ہے یہ.....؟ بشارت میز صاف کرتے ہوئے سوچ رہا تھا لیکن ذہن میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ آواز اس نے کب اور کہاں سنی تھی لیکن میز صاف کر کے وہ جیسے ہی پلٹا دوسری میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک کو دیکھتے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ اور ہاتھ سے کپ چھوٹ کر فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

"شکرا.....!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ شکرا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات ابھرے اور دوسرے ہی لمحہ وہ اٹھ کر بشارت سے لپٹ گیا۔

اوہ میڑا جگڑ کدھڑا ے بھئی توں اور یہ کیا حال ہو گیا شہزادے۔" شکرے نے سر تا پا اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"شکرے۔ خدا کے لئے یہاں جیل کا تذکرہ مت کرنا۔ اگر سیٹھ کو پتا چل گیا تو وہ مجھے نوکری سے جواب دے دے گا۔" بشارت نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ میڑا کہنا مان لو۔ پھڑ تمہارے دل میں کبھی یہ خوف نہیں آئے گا۔" شکرا مسکرایا۔

"مجھے گمراہ کرنے کی کوشش مت کرو شکرے۔" بشارت نے کہا۔

"تیڑ چھوڑو اس ذکر کو۔ میں جانتا ہوں تم ایک دن خود بخود چل کر میری پاس آؤ گے۔ آ میں تمہیں اپنے استاد سے ملاؤں۔" شکرے نے کہا اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر شخص سے بولا۔

"استاد۔ یہ ہے اپنا جگڑ بشارت جس کا میں تم سے کئی مرتبہ ذکر کر چکا ہوں۔"

وہ استاد گنگو تھا۔ لاہور کے جیب کتروں کا بے تاج بادشاہ۔ بشارت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود قابل رشک صحت' پھولے ہوئے گال' بھاری جبڑے' گھنی مونچھیں اور اوپر کو چڑھی ہوئی موٹی موٹی سرخ آنکھیں۔

استاد گنگو نے بشارت سے ایک دو باتیں پوچھیں لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور پھر جلدی سے بولا۔

"دو چائے لاؤں؟"

"ہاں۔ ایک دم فسٹ کلاس۔ ملائی والی۔" شکرے نے بشارت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

بشارت نے ان کے سامنے چائے کے دو کپ لا کر رکھ دیئے اور دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے شکرے اور استاد گنگو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں خوف جاگزیں ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب شکرا اور استاد گنگو جانے لگے تو کتنی ہی دیر تک کاؤنٹر کے قریب کھڑے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ بشارت کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ خوف ایک بار پھر سر ابھارنے لگا تھا کہ شکرا ہوٹل کے مالک کو اس کے بارے میں کچھ بتا تو نہیں رہا لیکن جب ان کے جانے کے ایک گھنٹے بعد بھی ہوٹل کے مالک نے اس سے کوئی استفسار نہیں کیا تو بشارت کو قدرے اطمینان ہوا کہ شکرے نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دن خیریت سے گزر گیا۔

ایبٹ روڈ پر واقع تمام سینماؤں کے آخری شو ختم ہو چکے تھے۔ سڑک سُونی ہو گئی۔ بشارت اپنا کام ختم کر کے جب ایک کونے میں سونے کی تیاری کرنے لگا تو ہوٹل کے مالک نے اسے بلا لیا۔ بشارت دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے قریب پہنچا۔

"لڑکے۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے خود کو بہت شریف بتایا تھا لیکن میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ تم جیب کترے ہو۔ سزا یافتہ ہو' میں تم

کو نوکری پر نہیں رکھ سکتا۔ یہ لو اپنا حساب اور چھٹی کرو۔ مجھے ایسا آدمی نہیں چاہئے جس سے ہوٹل کی بدنامی ہو۔" مالک نے چند روپے جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"لیکن سیٹھ جی۔ میں نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ میں تو بے قصور پکڑا گیا تھا۔ میں نے کسی کی جیب نہیں کاٹی۔" بشارت نے اپنی صفائی پیش کی۔

"نہیں بابا۔ ہم نے سب کچھ سن لیا ہے۔ ہم تم کو نہیں رکھے گا۔ اپنا پیسہ لو اور ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔" سیٹھ نے کہا۔

بشارت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شکرے اور گنگو نے اس کے خلاف سیٹھ کے کان خوب اچھی طرح بھر دیئے تھے اور اب اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنا بیکار ہو گا۔

بشارت اس سائبان دربار مغلیہ ہوٹل سے نکل کر چند ہی گز دور گیا تھا کہ ایک پولیس والے نے اسے پکڑ لیا۔

"اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو پھڑکا دیئے جاؤ گے۔ خاموشی سے میرے ساتھ تھانے چلو۔" کانسٹیبل نے اس کی کلائی گرفت میں لے لی۔

"مم..... مگر کیوں۔ میں نے کیا کیا ہے؟" بشارت ہکلا گیا۔

"یہ تو تھانے پہنچ کر ہی معلوم ہو گا۔ تمہارا نام بشارت ہے اور تم اس ہوٹل میں کام کرتے ہو نا؟" کانسٹیبل نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہوٹل کے سامنے والے سینما میں ایک شخص کی جیب کٹ گئی تھی۔ اس لئے تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔"

"سینما میں کسی کی جیب کٹ گئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور؟" بشارت نے کہا۔

"چل تھانے۔ حرامی....." کانسٹیبل نے اسے زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ تھانے پہنچ کر ایک ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی تلاشی لی اور جیب سے پیسے نکال کر اپنی جیب میں ڈال لئے اور پھر بشارت کو گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

بشارت کو رات بھر برآمدے میں بٹھائے رکھا۔ اس دوران جو بھی پولیس والا وہاں آتا اس سے ایک دو باتیں پوچھتا اور ایک دو تھپڑ مار کر چلا جاتا۔ صبح ہوئی تو ہیڈ کانسٹیبل نے اسے دو چار ہاتھ رسید کرنے کے ساتھ وارننگ دے کر بھگا دیا۔ بشارت نے اپنے

پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کیا تو اسے دو تھپڑ اور کھانے پڑے تھے۔

وہ نڈھال سا سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی لیکن اس کی جیب خالی تھی۔ اس کی پونجی پر قانون کے محافظ لٹیروں نے قبضہ کر لیا تھا۔

وہ ایک بار پھر کام کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا لیکن وہ جہاں بھی جاتا اس کے جیل جانے کی داستان اس سے پہلے وہاں پہنچ جاتی۔ بشارت حیران تھا کہ سب لوگوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ وہ سزا یافتہ ہے۔

لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ صبح جب وہ تھانے سے نکلا تھا تو ایک اجنبی چہرہ سائے کی طرح اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ یہ اجنبی استاد گنگو کا ایک شاگرد تھا۔ بشارت جہاں بھی جاتا وہ اس کے پیچھے ہی پہنچ جاتا اور مالک کو بشارت کے بارے میں بتا کر باہر نکل جاتا۔

آٹھ دس روز گزر گئے۔ اس دوران بشارت کو دو تین مرتبہ ہی مزدوری مل سکی تھی۔ جس سے ملنے والے پیسے اس نے نہایت کفایت شعاری سے خرچ کئے تھے لیکن اب اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

آج دوسرے دن کا فاقہ تھا۔ دو دن سے ایک کھیل بھی اس کے منہ میں نہیں گئی تھی۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو سڑک کے کنارے لگے ہوئے کسی نل سے پانی پی لیتا۔ خالی پیٹ پانی پی پی کر اس کی طبیعت بھی خراب ہونے لگی تھی۔

تیسرے دن بھوک اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ داتا صاحب کے مزار پر پہنچ گیا اور لائن میں کھڑے ہو کر ایک روٹی اور اس پر دال لے کر کھانے لگا لیکن اسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر اس کے قدم خود بخود لکشمی چوک کی طرف اٹھنے لگے۔

وہ لکشمی چوک پر چرخے والی دکان کے سامنے کھڑا ویران ویران سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک نوجوان اس کے قریب آ کر سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"تمہیں شاید کسی کی تلاش ہے؟"

"ہاں، مجھے استاد گنگو کے ڈیرے کی تلاش ہے۔"

"میرے ساتھ آؤ۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا اور ایک طرف چل دیا۔

بشارت کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے چل پڑا۔ چوک پار کر کے وہ نسبت روڈ پر آ گئے۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گندی سی گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر لکڑی کا ایک ٹوٹا پھوٹا سا پھاٹک تھا۔ بشارت اس نوجوان کے پیچھے چلتا ہوا پھاٹک میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں ایک طرف چند تانگے کھڑے تھے اور چار پانچ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ احاطے میں ہر طرف گندگی اور لید کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان بشارت کو اشارہ کرتا ہوا احاطے میں ایک طرف بنے ہوئے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بشارت بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے کے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف تین چار لڑکے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے اور دوسری طرف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے استاد گنگو اور شکرا باتیں کر رہے تھے۔ شکرے نے بشارت کو دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس سے لپٹ گیا۔

"اوہ میرا شہزادہ آ گیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ ایک دن تم خود آؤ گے۔" شکرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"شکرے۔" بشارت کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔ "میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا، یار۔"

"تو دیکھ لیا اپنی نیکی اور شرافت کا انجام۔" شکرے کے لہجے میں بے پناہ طنز تھا۔ "تمہاری دیانت اور ضمیر تمہیں تین دن سے بھوک سے تڑپا رہا ہے۔ یار تیری شرافت نے کوئی مدد کیوں نہیں کی۔"

"چپ ہو جاؤ شکرے۔" بشارت نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔ "میں جان گیا ہوں کہ اس دنیا میں پیٹ بھرنے کے لئے روٹی کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ ضمیر کی باتیں نہ کرو۔ ضمیر تو واقعی ایک بے مقصد بوجھ تھا جسے میں اپنے سینے میں لئے پھرتا رہا۔"

اس دوران استاد گنگو نے ایک لڑکے کو بھیج کر حلوائی کی دکان سے آدھا لیٹر گرم گرم دودھ منگوا لیا تھا۔ دودھ پی کر کچھ سہارا ہوا لیکن تین دن سے بھڑکنے والی بھوک کی آگ اتنے سے دودھ سے تو نہیں بجھ سکتی تھی۔ بشارت سوالیہ نگاہوں سے شکرے کی طرف دیکھنے لگا۔

شکرا اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ "پہلے دودھ تو اس لئے منگوایا تھا

کہ تم تین دن سے بھوکے ہو' اور ایک دم کھانا کھا کر کہیں تمہاری طبیعت نہ بگڑ جائے۔"

استاد گنگو نے دارا نامی اسی لڑکے کو قریب بلا کر کچھ کہا۔ وہ سر ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

دارا کی واپسی آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی بڑی سی ٹرے بشارت کے سامنے رکھ دی۔ ایک پلیٹ میں بھنا ہوا گوشت' ایک میں تکے اور شامی کباب اور تنوری روٹیاں تھیں۔ بشارت کمرے میں موجود افراد کا خیال کئے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑا اور چند منٹ بعد ہی ساری پلیٹیں صاف ہو چکی تھیں۔

استاد گنگو اور شکرا معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کھانے کے بعد بشارت نے پانی کا گلاس پیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ حواس بحال ہونے کے بعد اس نے پہلی مرتبہ کمرے میں موجود افراد کا جائزہ لیا۔

"اوڑ کھاؤ گے!" شکرے نے پوچھا۔

"نہیں۔" بشارت نے مختصر سا جواب دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ پیٹ بھر جانے کے بعد اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو رہی تھیں۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے۔ آرام سے لیٹ کر سو جاؤ۔" استاد گنگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

بشارت نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دری پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ گہری نیند سو چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

بڑی عجیب زندگی تھی یہ بھی۔

جرائم پیشہ لوگوں کے بیچ میں رہتے ہوئے بشارت بھی جرائم پیشہ بن گیا۔ اس شرافت کی زندگی گزارنے کی کوشش کر کے دیکھ لیا تھا۔ اسے ایک وقت کی روٹی نہیں تھی۔ کوئی اسے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا لیکن اب اس نے شرافت کا یہ لبادہ اتار پھینکا اب وہ بشارت نہیں بشاری تھا۔ جیب کترا بشاری..... اسے کسی کی جیب کاٹتے ہو کوئی افسوس نہیں ہوتا تھا۔

استاد گنگو کا اپنے گروہ پر مکمل ہولڈ تھا۔ اس گروہ میں نو عمر لڑکے بھی تھے اور جوان آدمی بھی۔ وہ سب رات گیارہ بجے کے لگ بھگ اڈے پر جمع ہوتے اور دن بھر کی کارکردگی کا حساب دیتے۔ استاد گنگو کے سامنے نوٹوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ کئی لڑکے ایسے بھی تھے جو تھوڑی بہت رقم مارنے کی کوشش کرتے تھے لیکن استاد گنگو بھی قیامت کی نظر رکھتا تھا۔ ایسے لڑکوں کو فوراً ہی تاڑ لیتا اور انہیں الٹا لٹکا دیتا لیکن وہ اپنے لڑکوں کا خیال بھی بہت رکھتا تھا۔ کسی پر کوئی افتاد پڑتی تو فوراً ہی مدد کو پہنچتا۔

استاد گنگو کے بعد شکرے کو اس گروہ میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شکرے نے بشارت کو اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔ جیل میں اس نے بشارت کو بہت کچھ سکھا دیا تھا اور اب عملی زندگی میں بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بشارت اپنے اس فن میں تاک ہوتا چلا گیا۔

•

بشارت کو پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں جن پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ شہر میں جیب تراشوں کے کئی گروہ سرگرم تھے۔ ہر گروہ نے علاقے بانٹ رکھے تھے۔ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ کے علاقے میں واردات نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ کسی شکار کے تعاقب میں دوسرے علاقے میں نکل جاتا تو اس گروہ کے کسی آدمی کو شکار کو نشاندہی کر کے واپس آ جاتا اور بعد میں اسے اپنا کمیشن مل جاتا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اس دوران بشارت کی زندگی میں کئی موڑ آئے۔ وہ کئی مرتبہ پکڑا گیا لیکن جیل جانے کی نوبت نہیں آئی۔ استاد گنگو کچھ اتنا ہی مضبوط اور بااثر تھا کہ اس گروہ کا کوئی لڑکا جب بھی پکڑا جاتا چند گھنٹوں بعد ہی اسے پولیس سے چھٹکارا مل جاتا۔

پہلی مرتبہ جب بشارت ایک ناکردہ جرم میں پکڑا گیا تھا تو اسے اپنی زندگی کے ستون لرزتے ہوئے محسوس ہوئے تھے لیکن گنگو کے گروہ میں شامل ہونے کے بعد اس کے دل سے ہر قسم کا خوف نکل گیا تھا۔ اسے نہ تو کبھی ضمیر نے کچوکے لگائے تھے اور نہ ہی شرافت نے کبھی اس کا دامن تھاما تھا۔

اس دوران بشارت ایک لمحہ کے لئے بھی نجمہ کی یاد سے غافل نہیں ہوا تھا۔ اس نے نجمہ کی تلاش و جستجو جاری رکھی لیکن اسے اپنی بہن کا سراغ کسی طرح سے بھی نہیں مل رہا تھا۔ کبھی کبھی تو رات کی تنہائیوں میں بہن کی یاد بری طرح تڑپا دیتی۔ اس کی

آنکھیں نم ہو جاتیں اور وہ ٹھنڈے سانس بھر کر رہ جاتا۔

نجمہ سے جدا ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ بشارت اب اکیس بائیس سال کا گبھرو جوان تھا۔ جن لوگوں نے اسے بچپن میں دیکھا تھا وہ اسے نہیں پہچان پاتے تھے۔ نجمہ تو اس سے ڈیڑھ سال بڑی تھی۔ وہ بھی بہت بدل گئی ہو گی۔ بشارت کے ذہن میں تو اس کا وہی چہرہ تھا جو اس نے دس سال پہلے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے نجمہ کبھی اس کے قریب سے گزری بھی ہو تو اسے نہ پہچان سکا ہو۔ مگر بشارت نے اس کی تلاش جاری رکھی۔

ایک روز استاد گنگو اپنے گروہ کو بے سہارا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ استاد گنگو کے مرنے کے بعد شکرے نے گروہ کی قیادت سنبھال لی اور بشارت کو اپنا نائب بنا لیا۔

استاد گنگو اور شکرے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ استاد گنگو نے دنیا دیکھی تھی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے واقف تھا۔ کوئی بڑا کام کرنے سے پہلے وہ ٹھنڈے دماغ سے سوچتا۔ اپنے گروہ کے آدمیوں پر اگرچہ وہ بعض اوقات سختی بھی کرتا تھا لیکن یہ سختی بلاوجہ نہیں ہوتی تھی۔ اسے گروہ پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔

استاد گنگو کی موت کے بعد اگرچہ شکرے نے اس کی جگہ سنبھال لی تھی لیکن بشارت دیکھ رہا تھا کہ شکرے میں وہ صلاحیت نہیں تھی۔ اس کی رگوں میں ابلتا ہوا خون تھا۔ دماغ میں بھی گرمی بھری ہوئی تھی۔ استاد گنگو کے بتائے ہوئے تمام اصولوں کو پس پشت ڈال کر اپنے آدمیوں پر بلا وجہ سختی کرنے لگا۔ دوسرے علاقوں میں جا کر وارداتیں کرنے لگا جس کی وجہ سے آئے دن دوسرے گروہوں کے آدمیوں سے لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔

بشارت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس طرح گروہ کا شیرازہ نہ بکھر جائے۔ اس نے کئی بار شکرے کو سمجھانے کی کوشش کی مگر شکرا اس کی باتوں پر دھیان دینے کے بجائے الٹا اس پر ناراض ہونے لگتا۔

شکرے کی ان بے جا سختیوں اور بے اصولیوں کی وجہ سے تین چار لڑکے اس سے کٹ کر دوسرے گروہوں میں چلے گئے۔ اس پر بھی اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

اس روز بشارت کشمیری بازار سے ہوتا ہوا شاہ عالمی کی طرف نکل آیا۔ وہ اس وقت اسٹون واش جینز اور نیوی بلو کلر کی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں سفید شوز تھے اور بال بھی سلیقے سے کٹے اور سیٹ کئے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جیب کترا ہے۔ اس وقت وہ کسی شکار کے پیچھے بھی نہیں تھا کیونکہ یہ علاقہ اس کا نہیں تھا۔ وہ تو محض گھومتا ہوا اس طرف آ گیا تھا۔ اس نے کشمیری بازار سے اپنے اور شکرے کے لئے سوٹ کے کپڑے اور اپنے ذاتی استعمال کے لئے چند ضرورت کی چیزیں خریدی تھیں۔ شاپنگ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

شاہ عالمی میں ہول سیل مارکیٹ کے سامنے چلتا ہوا وہ ایک جگہ رک گیا۔ سڑک کے دوسری طرف ممتاز محل ہوٹل سے ذرا ہٹ کر وہ بلڈنگ تھی جس کی پہلی منزل پر چوہدری عمر کا دفتر تھا۔ وہ چوہدری کو بھولا نہیں تھا۔ وہ گنگو کے گروہ کی سرگرمیوں میں کچھ اس طرح الجھا تھا کہ اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور اس وقت اتفاق سے اس طرف نکل آیا تھا اور رک کر اس بلڈنگ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ سڑک پار کر کے سیٹھ عمر کے دفتر میں گھس جائے اور اس سے حساب برابر کرے لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ اس نے یہ بہرحال طے کر لیا تھا کہ اب بہت جلد سیٹھ عمر سے ملاقات کرے گا۔

اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ اپنا راستہ ناپنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سڑک کے دوسری طرف شکرے کو دیکھ کر چونک گیا۔ شکرا ایک آدمی کا تعاقب کر رہا تھا۔ بشارت کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شکار کا پیچھا کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس کا علاقہ نہیں تھا۔ مگر شکرے نے تو اپنے دھندے کے سارے اصول بھلا رکھے تھے۔

گرے کلر کے سفاری سوٹ میں ملبوس وہ آدمی شکرے سے تقریباً دس گز آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا چرمی بیگ تھا اور شکرے کی نظریں اس بیگ پر لگی ہوئی تھیں۔ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے بشارت کو ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ شکرے کے پیچھے بھی دو آدمی آ رہے تھے۔ ان میں ایک درمیانے قد کا تھا اور دوسرا قدرے دراز قامت۔ ایک نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور دوسرے نے پینٹ شرٹ۔

بشارت کی چھٹی حس اسے گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں فوراً ہی

خیال ابھرا کہ شکرے کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ یہ سوچ کر ہی وہ سڑک پار کرنے کے لئے فٹ پاتھ سے اترا لیکن دائیں طرف سے آنے والی ویگن کی وجہ سے اسے رک جانا پڑا اور جب ویگن اس کے سامنے سے گزر گئی تو وقت بھی گزر چکا تھا۔

شکرا بڑی تیزی سے اس آدمی کے قریب پہنچا اور اس کے ہاتھ سے سیاہ رنگ کا چرمی بیگ جھپٹ لیا لیکن اس سے پہلے کہ شکرا وہاں سے بھاگ سکتا پیچھے آنے والے دونوں آدمی چیختے ہوئے اس کی طرف دوڑے۔

بشارت نے بھی اپنی جگہ سے دوڑ لگا دی۔ شکرا بلند عمارتوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔ پیچھے دوڑنے والے دونوں آدمیوں میں سے ایک نے پستول نکال کر شکرے پر گولی چلا دی۔ شکرا چیختا ہوا گرا۔ چرمی بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس شخص نے دوبارہ فائر کرنے کے لئے ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اسے گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ بشارت ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر جا رہا اور اسے ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔ اس سے پہلے کہ نیچے گرا ہوا آدمی سنبھل سکتا بشارت نے اس کا پستول والا ہاتھ گرفت میں لے لیا اور شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

"بھاگ..... شکرے بھاگ....."

شکرا اپنی جگہ سے اٹھا تو تھا لیکن دوبارہ گر گیا۔ اس کی ٹانگ میں گھٹنے سے ذرا اوپر گولی لگی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ بشارت اپنے نیچے دبے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں ٹرائیگر دب گیا۔ گولی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک کار کے ٹائر میں لگی اور ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ بشارت اس شخص کا پستول والا ہاتھ مروڑ رہا تھا کہ اس کے سر پر زوردار ٹھوکر لگی۔ یہ ٹھوکر دوسرے آدمی نے ماری تھی۔ بشارت کا دماغ جھنجنا اٹھا اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ شخص دوسری ٹھوکر مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بشارت نے تیزی سے اپنا سر جھٹکے سے ایک طرف ہٹا لیا۔ یہ ٹھوکر اس شخص کے سر پر لگی جو بشارت کے نیچے دبا ہوا تھا۔

وہ شخص بلبلا اٹھا۔ پستول پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بشارت نے اس کے ہاتھ سے پستول چھینا اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی پستول تھا لیکن شاید وہ گولی چلائے بغیر بشارت کو زیر کر لینا چاہتا تھا اور اب اس نے بشارت کو اٹھتے

دیکھا تو پستول تان لیا لیکن بشارت بھی اب نہتا نہیں تھا۔ نیچے گرے ہوئے شخص کا پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر یکے بعد دیگرے دو مرتبہ ٹرائیگر دبا دیا۔ ایک گولی سامنے کھڑے ہوئے شخص کے سینے میں لگی اور دوسری اس کی ٹھوڑی کے نیچے پیوست ہو گئی۔ وہ شخص اپنے ساتھی کے قریب ہی ڈھیر ہو گیا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

بشارت نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کو دیکھا۔ یہ خطرناک ہتھیار اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ میں پکڑا تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اس نے گولی کیسے چلا دی۔

فائرنگ سے بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ گرے کلر سفاری سوٹ والا وہ شخص، جس کے ہاتھ سے شکرے نے چرمی بیگ چھینا تھا، وہ بھی چیختا ہوا ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ بشارت اٹھ کر دوڑتا ہوا شکرے کے قریب پہنچ گیا جو اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بشارت نے اس کی ٹانگ سے خون بہتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شکرے کی سفید پینٹ خون میں تر ہو رہی تھی۔ بشارت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔

"بھاگو شکرے....."

"ٹانگ میں گولی لگی ہے بشارت۔ جگڑ تُو نکل جا۔" شکرے نے کراہتے ہوئے جواب دیا اور یہ بیگ۔ اس میں لمبی رقم ہے۔ میں تمہارے بارے میں زبان نہیں کھولوں گا۔ نکل جاؤ میرے یار۔ وقت ضائع مت کرو۔"

"نہیں میرے دوست۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" بشارت نے کہا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔" شکرا کراہا۔ "ضد نہ کر اور پولیس کے آنے سے پہلے یہاں سے نکل....."

شکرے کا جملہ پورا نہ ہو سکا۔ فضا پے در پے فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ شکرے کے جسم کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ تین فائر ہوئے تھے اور چلائی جانے والی تینوں گولیاں شکرے کے جسم میں پیوست ہو گئی تھیں۔

بشارت نے سامنے دیکھا۔ وہ آدمی جس نے سب سے پہلے شکرے کی ٹانگ پر گولی چلائی تھی اور جس سے بشارت نے پستول چھینا تھا' اپنے مردہ ساتھی کا پستول لئے کھڑا تھا۔ وہ تین گولیاں چلا چکا تھا جو شکرے کو لگی تھیں۔ بشارت نے اسے چوتھی گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے شکرے کو سنبھالے رکھا اور پستول والا ہاتھ اٹھا کر ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ اس کے پستول سے تین گولیاں نکلیں اور تینوں کی تینوں اس شخص کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

بشارت نے شکرے کو آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ شکرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں رک کر یا شکرے کو اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس نے شکرے کے ہاتھ سے سیاہ رنگ کا وہ چرمی بیگ لے لیا جس کے لئے اس نے اپنی جان دے دی تھی۔

ٹھیک اسی لمحہ پولیس سائرن کی آواز سن کر بشارت چونک گیا۔ اس نے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ جان کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ سڑک کے دوسری طرف دکانوں کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے اور اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

سائرن کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ بشارت ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں چرمی بیگ سنبھالے عمارتوں کے درمیان اس تنگ سی گلی میں گھس گیا اور اندھا دھند بھاگنے لگا۔ اس نے پستول ایک جگہ نالی میں پھینک دیا اور ایک اور تنگ سی گلی میں مڑ گیا۔

رات کا وقت ہوتا تو شاید وہ تاریکی میں پولیس کو چکمہ دے کر ان کے قریب سے ہی نکل جاتا لیکن یہ دن کا وقت تھا۔ پیچ و خم کھاتی ہوئی گلیاں اس کے لئے اجنبی تھیں۔ یہ بھی ڈر تھا کہ وہ ان گلیوں میں چکراتا ہوا دوبارہ اس جگہ نہ پہنچ جائے یا کسی موڑ پر پولیس سے سامنا نہ ہو جائے۔

وہ گلیوں میں دوڑتا رہا۔ ان گلیوں میں بعض لوگوں نے اسے دیکھا بھی تھا لیکن اس پر توجہ اس لئے نہیں دی کہ یہاں تک فائرنگ کی آواز نہیں پہنچی تھی اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ممتاز محل ہوٹل کی طرف کوئی ہنگامہ ہو چکا ہے۔ ویسے بھی بشارت کسی

کو آتے ہوئے دیکھتا تو دوڑنے کی بجائے تیز تیز قدموں سے چلنے لگتا تاکہ دوڑنے سے کوئی اس پر شبہ نہ کر سکے۔

وہ ان پُر پیچ گلیوں میں چکراتا ہوا دوسری طرف ایک کشادہ سڑک پر نکل آیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہاں صورت حال معمول پر تھی۔ اب سے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں پر ہے۔ یہ سڑک دائیں طرف تقریباً دو سو گز آگے رنگ محل پر اسی سڑک سے جا ملتی تھی جس پر ذرا آگے جا کر ممتاز محل ہوٹل کی طرف سارا ہنگامہ ہوا تھا۔ جبکہ بائیں طرف یہی سڑک طویل فاصلہ طے کرتی ہوئی شاہی قلعہ' بادشاہی مسجد اور شاہی محلے سے ہوتی ہوئی نکسالی گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔

بشارت بائیں طرف مڑ کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اسے کسی خالی رکشہ یا ٹیکسی وغیرہ کی بھی تلاش تھی تاکہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکل کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائے۔

ابھی اس نے چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے قریب رکی۔ بشارت اچھل پڑا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ سرخ رنگ کی شیراڈ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک جوان اور حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پسنجرز سیٹ پر جھکی اس طرف کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس کا سیدھا ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر ہی تھا۔ کار میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ بشارت نے اس کی طرف دیکھا اور جیسے ہی آگے بڑھنے لگا اس عورت کی آواز سن کر چونک گیا۔

"آؤ۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

"جج..... جی..... میں....." بشارت کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عورت کسی اور سے بات کر رہی تھی مگر کار کے قریب اور کوئی نہیں تھا۔

"ہاں تم۔" عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "جلدی کرو۔ پولیس اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ تمہارے لئے بچ کر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس عورت نے شاید اسے وہاں دیکھا تھا اور

پہچان لیا تھا لیکن وہ اسے پولیس سے کیوں بچانا چاہتی تھی۔ اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ جلد سے جلد اس علاقے سے نکلنا چاہتا تھا اور یہ عورت اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس نے ہینڈل میں ہاتھ رکھ کر دروازہ کھول لیا اور بینچرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرتے ہی کار حرکت میں آ گئی۔ بشارت نے چرمی بیگ اپنی گود میں رکھ لیا اور اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ عورت بار بار عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے صرف ایک مرتبہ بشارت کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بشارت کا خیال تھا کہ وہ کچھ کہے گی لیکن اس کے لب خاموش ہی رہے۔

اور پھر پولیس سائرن کی آواز سن کر بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا پولیس کی گاڑی رنگ محل کی طرف سے اس سڑک پر مڑی تھی اور بڑی تیزی سے آگے آ رہی تھی۔ بشارت کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا۔ اس عورت کے چہرے پر بھی ایک لمحہ کو گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی پھر اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور بشارت کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"گھبراؤ نہیں۔ پولیس کو ایک ایسے قاتل کی تلاش ہے جو پیدل ہی بھاگا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ چرمی بیگ کے علاوہ پستول بھی ضرور ہونا چاہئے۔ تمہارے پاس پستول نہیں ہے اور گود میں رکھا ہوا یہ چرمی بیگ پیروں کے قریب ڈال دو اور اگر نیچے بنیان پہن رکھی ہو تو یہ ٹی شرٹ اتار دو۔ قاتل کی شناخت میں گہرے نیلے کی رنگ کی ٹی شرٹ بھی ہو سکتی ہے۔ جلدی کرو۔ پولیس کی گاڑی قریب پہنچ رہی ہے۔"

بشارت نے چرمی بیگ پیروں کے قریب ڈال دیا اور قدرے آگے جھک کر ٹی شرٹ اتارنے لگا۔ اس نے ٹی شرٹ بھی پیروں کے قریب ڈال دی اس نے جسم پر بنیان پہن رکھی تھی۔ اب وہ فوری طور پر اس حیثیت سے نظروں میں نہیں آ سکتا تھا جس حیثیت سے پولیس کو اس کی تلاش تھی۔

"پچھلی سیٹ پر شاپنگ بیگز پڑے ہوئے ہیں وہ اٹھا کر ٹی شرٹ اور چرمی بیگ پر رکھ دو۔" عورت نے دوبارہ کہا۔

بشارت مڑ کر پچھلی طرف جھک گیا۔ پچھلی سیٹ پر چار شاپنگ بیگز پڑے ہوئے تھے

جن میں مختلف دکانوں سے خریدی ہوئی مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے تین بیگ اٹھا کر اپنے پیروں کے قریب اس طرح رکھ لئے کہ اس کی ٹی شرٹ اور چرمی بیگ ان کے نیچے چھپ گئے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ اس عورت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھنے لگی۔

"خطرہ ٹل گیا۔ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

سائرن کی آواز اب کسی قدر دھیمی ہو گئی تھی۔ بشارت نے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑی ان سے تقریباً پچاس گز پیچھے بائیں طرف ایک کشادہ گلی میں مڑ رہی تھی۔ بشارت کے منہ سے بھی گہرا سانس نکل گیا۔ عورت کی وہ بات درست ثابت ہوئی تھی جو اس نے بشارت کو بٹھانے کے لئے کار روکتے ہوئے کہی تھی۔ پولیس اس طرف سے ان گلیوں کو گھیرے میں لے رہی تھی جن سے نکل کر وہ اس سڑک پر آیا تھا۔

"تم کون ہو؟" بشارت نے سیدھے ہو کر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم جان چکی ہو میں قاتل ہوں اور پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود تم نے یہ رسک لیا۔ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔"

"خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔" اس عورت نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ہو سکتا ہے پولیس نے وائرلیس پر آس پاس کے تمام تھانوں کو بھی اطلاع دے دی ہو۔ آگے ایک پولیس چوکی ہے۔ ممکن ہے اس چوکی کا عملہ الرٹ ہو چکا ہو اور انہوں نے کسی قسم کی چیکنگ بھی شروع کر دی ہو۔ تمہاری بنیان پر خون کا یہ ہلکا سا دھبہ انہیں کسی شبہہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔"

بشارت چونک گیا۔ اس نے گردن جھکا کر بنیان پر نظر ڈالی۔ اس نے جب شکرے کو سہارا دے کر اٹھا رکھا تھا تو اس وقت شکرے کو گولیاں لگی تھیں اور اس کے خون کے چھینٹے بشارت کی ٹی شرٹ پر بھی گرے تھے۔ ٹی شرٹ نیوی بلیو رنگ کی تھی۔ خون کی سرخی اس گہرے رنگ میں چھپ گئی تھی لیکن وہ خون ٹی شرٹ میں جذب ہو کر نیچے بنیان پر دھبہ ڈال گیا تھا۔ جو اگرچہ زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن پولیس والوں کو شبہہ میں مبتلا کر سکتا تھا۔

"تمہارے پیروں کے پاس پڑے ہوئے نیلے شاپنگ بیگ میں سرخ رنگ کی ایک ٹی

شرٹ بھی موجود ہے۔ وہ نکال کر پہن لو۔ اس سے نہ صرف بنیان پر لگا خون کا دھبہ چھپ جائے گا بلکہ تمہارا حلیہ بھی بڑی حد تک بدل جائے گا۔"

اس مرتبہ بھی اس عورت نے بات کرتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

بشارت کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہ عورت اسے ہر صورت میں پولیس سے بچانا چاہتی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وقت ضائع مت کرو۔ پولیس چوکی اب زیادہ دور نہیں ہے۔" اس عورت نے کہا۔

بشارت آگے جھک گیا اور نیلے رنگ کے شاپنگ بیگ پر لگی ہوئی گرہ کھولنے لگا۔ اس شاپنگ بیگ میں ریڈی میڈ کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ جینز اور مختلف رنگوں کی تین چار شرٹس۔ سرخ رنگ کی ٹی شرٹ سب سے نیچے تھی جسے اس نے کھینچ لیا اور نیچے جھکے ہی جھکے پہن کر سیدھا ہو گیا۔ یہ ٹی شرٹ بنیان کی طرح بغیر آستین کی تھی لیکن اس کی سفید بنیان بہرحال اس کے نیچے چھپ گئی تھی۔

اس عورت کا خیال درست نکلا تھا۔ وائرلیس کے ذریعے شہر کے تمام تھانوں کو اس واردات اور مفرور قاتل کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس سڑک پر تقریباً نصف میل آگے پولیس چوکی تھی۔ چوکی کے سامنے سڑک بلاک کر دی گئی تھی اور چار پولیس اہلکار گاڑیاں اور رکشے وغیرہ روک کر انہیں چیک کر رہے تھے۔

ان سے آگے دو کاریں اور تین رکشے رکے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہیں چیک کر کے باری باری آگے جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ایک نوجوان اے ایس آئی ان کی کار کی طرف بڑھا تو بشارت کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اے ایس آئی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ کار کے قریب آ کر بشارت کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے آفیسر؟" عورت نے اسے فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "آج یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟"

"ایک بدمعاش رنگ محل کے قریب تین آدمیوں کو قتل کر کے بھاگا ہے۔ اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ آپ نے راستے میں کسی ایسے آدمی کو تو نہیں دیکھا جس نے نیلی جینز اور گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہو؟" اے ایس آئی نے کہا۔

"اتفاق سے ایسا کوئی بندہ راستے میں نظر نہیں آیا۔" عورت جواب دیا۔

"شکریہ میڈم۔ آپ جا سکتی ہیں۔" اے ایس آئی کہتے ہوئے ان سے پیچھے رکنے والی ایک اور کار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عورت نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بشارت کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ بشارت کو اس کے حوصلے کی داد دینی پڑی۔ پولیس آفیسر سے بات کرتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں گھبرائی تھی۔ حالانکہ اگر آفیسر یہی باتیں بشارت سے کرتا تو وہ یقیناً گڑبڑا جاتا۔

"تم کون ہو جو ایک اجنبی کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال رہی ہو؟" بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ تم واقعی میرے لئے اجنبی ہو۔" عورت نے جواب دیا۔ "لیکن باتیں اطمینان سے ہوں گی اور یہ تسلی رکھو کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

بشارت واقعی خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے کبھی چیونٹی بھی نہیں ماری تھی اور آج دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ راستے میں چیکنگ کے دوران پولیس آفیسر کی باتوں سے انکشاف ہوا تھا کہ شکرے کا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ کانپ اٹھا۔ اسے شکرے کی موت کا افسوس تھا لیکن اسے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے کس طرح دو آدمیوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ شخص شکرے پر گولی نہ چلاتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ وہ اسے مار پیٹ کر پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اس طرح شکرے کی زندگی تو بچ جاتی لیکن شکرے کو بیگ چھین کر بھاگتے دیکھ کر اس شخص نے گولی چلا دی تھی۔ شکرے کو بچانے کے لئے اس نے پستول والے شخص پر چھلانگ لگا دی تھی جس کا نتیجہ اس قدر بھیانک نکلا تھا۔

کار اس چوراہے پر پہنچ گئی جہاں سے ایک سڑک شاہی محلے سے ہوتی ہوئی نکسالی گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ دوسری ذرا آگے دائیں طرف مڑ کر شاہی قلعے کی فصیل کے ساتھ ساتھ شیرانوالہ دروازے کی طرف۔ سامنے ہی وہ سڑک بھی تھی جو قلعے اور بادشاہی مسجد کے درمیان ہوتی ہوئی منٹو پارک کی طرف نکل جاتی تھی۔ یہ راستے بشارت کے

دیکھے بھالے تھے۔ بچپن میں جب وہ علامہ اقبال کے مزار پر آیا کرتا تھا تو گلیوں سے ہوتا ہوا اس راستے پر جایا کرتا تھا۔

اس چوراہے سے ایک اور ترچھی سڑک بھی دائیں طرف نکلتی تھی۔ اس عورت نے کار اسی سڑک پر موڑی تھی۔ یہ سڑک نسبتاً کشادہ تھی لیکن آگے جا کر بتدریج تنگ ہوتی چلی گئی اور چھوٹی چھوٹی لاتعداد گلیاں تھیں جو مکڑی کے جال کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

اس سڑک پر کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس عورت نے کار بائیں طرف ایک کشادہ گلی میں موڑلی۔ تقریباً سو گز آگے جا کر یہ گلی ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے آگے جھیل کی طرح ایک بہت بڑا جوہڑ تھا جو دور تک پھیلا ہوا تھا۔ آس پاس کے علاقوں کا سارا گندہ پانی اس جوہڑ میں آ کر گرتا تھا۔ جس وجہ سے فضا میں ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جوہڑ کے کنارے پر کافی اندر تک سرکنڈے کے پودے پھیلے ہوئے تھے اور محلے کے کچھ ننگ دھڑنگ بچے گندے پانی میں کھیل رہے تھے۔

کار بائیں طرف والے آخری مکان کے سامنے رک گئی۔ ہارن بجانے کے ایک منٹ بعد گیٹ کھل گیا اور وہ عورت کار کو اندر لے گئی۔

باہر سے یہ مکان اگرچہ چھوٹا سا لگتا تھا لیکن اندر سے کافی بڑا تھا۔ صحن بھی بہت کشادہ تھا۔ گیٹ سے برآمدے تک پختہ روش کے دائیں بائیں لان تھے جن کے کناروں پر پھولوں کے پودے تھے۔ پودوں پر اگرچہ خوشرنگ پھول کھلے ہوئے تھے لیکن ان کی خوشبو بھی جوہڑ کی طرف سے آنے والی ناگوار بو کے تاثر کو کم کرنے میں ناکام رہی تھی۔

دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا تھا جو حلیے اور لباس سے ملازمہ ہی لگتی تھی۔ پختہ روش پر برآمدے کے قریب کار روک کر اس عورت نے انجن بند کر دیا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ بشارت نے بھی اس کی تقلید کی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جوہڑ کی طرف والی دیوار خاصی اونچی تھی۔ پوری دیوار پر عشق پیچاں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں جن میں کاسنی اور بنفشی رنگ کے پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف مکان تھا۔ اس طرف کی دیوار بھی کافی اونچی تھی۔ پچھلی طرف بھی مکان ہی تھا۔ جبکہ

سامنے کے رخ پر وہ گلی تھی جس سے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔

اس مکان میں دو بیڈ رومز' ایک ہال کمرہ اور ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ کمروں میں آراستہ سامان خاصا قیمتی اور خوبصورت تھا۔ وہ شیراڈ کار بھی نئی ہی تھی جس پر بشارت یہاں تک آیا تھا۔ ان تمام چیزوں سے اس عورت کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

گیٹ کھولنے والی ادھیڑ عمر عورت کار سے سامان نکالنے کے لئے اس طرف بڑھی تو بشارت کے ساتھ آنے والی حسین عورت نے اسے روک دیا۔

"بی بی' کار سے سامان میں خود نکال لوں گی۔ تم ہمیں چائے بنا دو اور چلی جاؤ۔ تمہاری بیٹی انتظار کر رہی ہو گی۔ آج تو تمہیں بہت دیر ہو گئی ہے۔"

وہ ادھیڑ عمر عورت جسے بی بی کے نام سے مخاطب کیا تھا پلٹ کر مکان کے اندر چلی گئی۔ وہ حسین عورت کچھ دیر وہاں کھڑی رہی پھر بشارت کو اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آؤ۔ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ بشارت کی زندگی اپنے کھنڈر نما مکانوں یا سڑکوں پر گزری تھی۔ کئی سال سے وہ استاد گنگو کے طویلے میں پڑا ہوا تھا۔ جہاں فرش پر بچھی ہوئی دری پر سویا کرتا تھا۔ بچپن میں وہ صفدر بابو کے گھر پڑھنے جایا کرتا تھا پھر ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر کام کرنے جاتا تھا لیکن ایسا قیمتی سامان تو اس نے کہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ فلموں میں ایسے گھر ضرور دیکھے تھے جن میں ایسا قیمتی ساز و سامان ہوتا تھا۔

فرش پر دبیز قالین' قیمتی صوفے' شیشے کی ٹاپ والی ایک سینٹر ٹیبل اور دو سائیڈ ٹیبل' ڈیکوریشن کا سامان بھی بڑا اعلیٰ اور قیمتی تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے بشارت نے جوتے دروازے ہی میں اتار دیئے تھے۔

"کیسا لگا میرا گھر؟" اس عورت نے مسکراتی ہوئی نظروں سے بشارت کی طرف دیکھا۔

"بہت اچھا۔" بشارت نے جواب دیا۔ وہ یہی کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک کمرہ دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ پورا گھر کیسا ہو گا۔ اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اس کی نظریں اپنی میزبان پر مرکوز ہو گئیں۔

اس نے پہلی مرتبہ توجہ سے اس عورت کی طرف دیکھا تھا۔ دراز قامت' گداز

جسم، کھلتے ہوئے گلاب جیسی رنگت، غزال جیسی موٹی موٹی آنکھیں جن میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ چہرے کے نقوش نہایت دلفریب اور آبدار موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے ہموار دانت۔ جب وہ مسکراتی تو بائیں رخسار پر ننھا سا گڑھا بن جاتا جو اس کے حسن میں چار چاند لگا دیتا۔ اس نے لون کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ قمیض اس قدر فٹ تھی کہ سینے کے ابھار بہت زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ گریبان بھی خاصا فراخ تھا۔ سامنے کھڑا ہوا کوئی بھی شخص بغیر کسی کوشش کے اندر تک جھانک سکتا تھا۔ بشارت کے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ یوں تو بشارت نے بہت سی حسین اور جوان عورتوں کو اپنے آس پاس سے گزرتے دیکھا تھا لیکن کسی عورت کو اس طرح قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس کی نظریں بار بار اس کے گداز سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دل کی دھڑکن بھی بے ربط ہو رہی تھی۔

"بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو؟" عورت نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

بشارت کے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ قریب کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد ہی بی بی چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں کپ شیشے کے ٹاپ والی سینٹر ٹیبل پر رکھ دیئے اور اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"سالن تیار ہو گیا ہے، میں نے روٹیاں بھی پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ دی ہیں۔ میں جا رہی ہوں۔ اب کل سویرے ہی آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" اس حسین عورت نے کہا اور بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بی بی کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد وہ باہر کا گیٹ بند کر کے واپس آ گئی اور صوفے پر بیٹھنے کی بجائے سینٹر ٹیبل کے قریب قالین پر بیٹھ گئی اور ایک کپ بشارت کی طرف سرکا دیا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے بشارت نے اس کی طرف دیکھا تو دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔

"میرا نام سنیتا ہے۔" اس عورت نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم یقیناً یہ جاننے کے لئے بے چین ہو گے کہ میں کون ہوں اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر میں تمہیں پولیس سے کیوں بچایا؟"

"اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں قاتل ہوں۔" بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں

جماتے ہوئے کہا۔ "کسی قاتل کو پناہ دینا نہ صرف سنگین جرم ہے بلکہ اپنے لئے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"خطرات سے کھیلنا شاید میری فطرت میں شامل ہے۔" سنیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں تم جیسے بہادر نوجوانوں کی قدر کرتی ہوں اور میں نے تمہاری دلیری سے متاثر ہو کر تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ چائے کے ایک دو گھونٹ بھرے پھر کپ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "تم جب شاہ عالمی مارکیٹ کی دکانوں کے سامنے رکے تھے تو میں اس وقت ایک دکان میں کھڑی اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خرید رہی تھی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ تم مجھے بے شرم کہہ سکتے ہو لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ تمہیں وہاں کھڑے دیکھ کر میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں بے خود سی ہو کر تمہیں دیکھتی رہی۔ میرے دل میں تم سے بات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی لیکن میں نے ابھی تمہاری طرف پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ تم سڑک کے دوسری طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرف کا منظر بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔ تمہاری طرح کا ایک نوجوان کسی آدمی کے ہاتھ سے چرمی بیگ چھین کر بھاگ رہا تھا۔ ایک اور آدمی نے اس پر گولی چلا دی۔ میرا خیال تھا کہ تم اس اچکے کو پکڑنے کے لئے بھاگے ہو لیکن تم نے اس شخص پر چھلانگ لگائی تھی جس نے گولی چلائی تھی۔ اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ میرے لئے حیرت انگیز تھا۔ تم اس نوجوان کی مدد کرنا چاہتے تھے جو گولی لگنے سے زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تم اس نوجوان کو جانتے ہو یا وہ تمہارا دوست ہے جسے تم بچانا چاہتے تھے اور اسے بچانے کے لئے تم نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا وہ قابل تعریف تھا۔ تم نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اگر آخر میں دوسرا آدمی گولیاں نہ چلاتا تو شاید تم اپنے زخمی ساتھی کو وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہو جاتے۔ قسمت نے تمہارے دوست سے تو وفا نہ کی لیکن تم دو آدمیوں کو گولیوں سے چھلنی کر کے وہاں سے نکل گئے۔ تم نے اپنے دوست کے ہاتھ سے وہ چرمی بیگ بھی لے لیا تھا جس کے لئے یہ سارا ہنگامہ ہوا تھا۔" وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

بشارت نے بھی اپنا کپ اٹھا لیا اور ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد میز پر رکھتے ہوئے

بولا۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں اس طرف سڑک پر آؤں گی۔"

"جس جگہ یہ ہنگامہ ہوا تھا وہاں سے کچھ ہی آگے میری کار کھڑی تھی۔" سنیتا نے کہا۔ "لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ سڑک کا وہ حصہ سنسان ہو گیا تھا۔ پولیس کے سائرن کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آ گئی۔ میں نے دوڑتے ہوئے سڑک پار کی اور اپنی کار وہاں سے نکال کر لے گئی۔ تم جس طرح اس تنگ سی گلی مین بھاگے تھے اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ تم گلیوں میں چکراتے رہنے کی بجائے اسی طرف سڑک پر نکل کر کوئی سواری حاصل کرنے کی کوشش کرو گے تاکہ اس علاقے سے نکل سکو۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا۔"

"بدقسمتی سے مجھے کوئی رکشہ یا ٹیکسی وغیرہ نہیں ملی تھی۔" بشارت نے کہا۔

"خوش قسمتی کہو۔" سنیتا نے کہا۔ "اگر تم کسی رکشہ یا ٹیکسی پر بیٹھ جاتے تو یقیناً پکڑے جاتے۔ مجھے تمہاری تلاش میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ تمہیں دیکھتے ہی میں نے کار روک لی۔ پولیس کو ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو اکیلا تھا اور جس نے نیلی جینز اور گہرے نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ تم میرے ساتھ تھے۔ شرٹ کا رنگ بھی تبدیل ہو گیا تھا اس لئے چیکنگ کے دوران میں پولیس کو تم پر شبہ نہیں ہوا۔"

"اگر واقعی تم بروقت میری مدد نہ کرتیں تو شاید میں اس قدر آسانی سے اس علاقے سے نہ نکل سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں لیکن....."

"شکریہ ادا کرنے کے لئے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔" سنیتا معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "ابھی تم فوری طور پر تو یہاں سے نہیں جا سکتے۔ باہر نکلنے میں تمہارے لئے خطرہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن شاید تم کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔"

"ہاں۔" بشارت بولا۔ "میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر نے مجھے کیوں بچایا۔ جب کہ اس قسم کی صورت حال میں لوگ دور ہی رہتے ہیں اور تم میرے بارے میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔"

"تمہارے بارے میں زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں۔ ویسے مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ تم کون ہو۔ اور رہا یہ سوال کہ میں نے تمہاری مدد کیوں کی تو اس سلسلے میں پہلے ہی

چکی ہوں۔ میری فطرت ہی کچھ ایسی ہے....."

"میرا خیال ہے اگر صحیح بات بتا دو تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" بشارت اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ وہ اب تک اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا چکا تھا اور یہ سوچ کر کہ وہ وقتی طور پر پولیس کی نظروں سے محفوظ ہو چکا ہے، وہ بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے۔" سنیتا نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سچ وہی ہے جو میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"یہاں اکیلی رہتی ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے گھر والے....."

"یہاں میں بالکل اکیلی ہوں۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے ماں باپ یا بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ شوہر کئی سال سے امریکہ میں ہے۔ وہاں اس نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔ مجھے تو وہ اس طرح بھول چکا ہے جیسے میں اس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھی۔"

"طلاق؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "میں نے ایک دو مرتبہ خلع کا مطالبہ کیا تھا لیکن اس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ وہ مجھے اسٹینڈ کے طور پر رکھنا چاہتا ہے تاکہ جب کبھی واپس آئے تو اسے عورت کی کمی محسوس نہ ہو۔"

"افسوس ہوا سن کر۔" بشارت بولا۔ "عدالت کے ذریعے بھی خلع لے سکتی تھیں۔"

"میں نے سوچا ضرور تھا پھر اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ خلع لے لیتی تو لوگ سمجھتے میں اکیلی ہوں۔ اس طرح لوگ کم سے کم یہ تو جانتے ہیں کہ میں ایک عدد شوہر بھی رکھتی ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی اس کی کمی بھی محسوس نہیں کی۔"

"تمہارا شوہر کئی سال سے باہر ہے۔ وہ تمہیں خرچ بھی نہیں بھیجتا ہو گا لیکن یہ مکان اور یہ سب کچھ....." بشارت خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"یہ مکان میرے شوہر کی ملکیت تھا لیکن میں نے عقلمندی یہ کی کہ شادی کے چند ہی روز بعد اپنے نام ٹرانسفر کروا لیا۔ اور باقی یہ سب کچھ۔" وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوئی پھر

بولی۔ "میں نے ایک چھوٹا سا بزنس شروع کر رکھا ہے جس سے مجھے اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے چند ایسے مخلص دوست بھی مل گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً میری مدد کرتے رہتے ہیں۔"

بشارت خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے ساری باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ سنیتا کا شوہر کئی سال سے امریکہ میں تھا جہاں اس نے دوسری شادی کر رکھی تھی۔ اس نے کبھی خرچ بھی نہیں بھیجا تھا۔ اور سنیتا یہاں شاندار زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بزنس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ اس کا شوہر اتنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر امریکہ کیوں چلا گیا تھا اور سنیتا کے وہ دوست کون تھے جو وقتاً فوقتاً اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔

کئی سال سے شکرے کے ساتھ رہتے ہوئے وہ بہت کچھ جان چکا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا بھی تجربہ تھا۔ بغیر مطلب کے تو کوئی کسی کو ایک وقت کی روٹی بھی نہیں کھلاتا تھا۔ وہ دوپہر سے رات تک ہیڈ ماسٹر کے گھر میں کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹے کی جھڑکیاں اور مار کھاتا تھا اور تب کہیں ایک وقت کی بچی کھچی روٹی ملتی تھی۔ اور صفدر بابو جو اسے بغیر فیس کے پڑھایا کرتا تھا لیکن اس کے ذریعے ہیروئن کے پیکٹ اِدھر اُدھر بھجواتا رہتا تھا۔ کئی سال بعد اسے پتہ چلا تھا کہ ہیروئن کیا ہوتی ہے اور اسمگلنگ کیسے کی جاتی ہے۔ ایسے کاروبار میں حسین اور جوان عورتوں کو استعمال کیا جاتا ہے جو مردوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔ کبھی پکڑی بھی جائیں تو آسانی سے اپنے آپ کو چھڑا لیتی ہیں۔

وہ دو آدمیوں کو قتل کر کے بھاگا تھا۔ تیسرا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لئے بھاگ رہا تھا ایسے میں سنیتا اسے اپنی گاڑی پر بٹھا کر لے آئی۔ اس نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے راستے ہی میں اس کی شرٹ تبدیل کروا دی تھی۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو سنیتا بھی اس کے ساتھ آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتی۔ اس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اسے پولیس سے بچایا تھا۔ بشارت یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سنیتا نے یہ سب کچھ اپنی مہم جو فطرت کے تحت کیا تھا یا وہ اس کی رعنائی پر مرمٹی تھی۔ شریف لوگ تو جرائم پیشہ لوگوں سے دور بھاگتے ہیں۔ چہ جائیکہ سنیتا ایک عورت ہوتے ہوئے ایک ایسے اجنبی کو گھر لے آئی تھی جس نے اس کی آنکھوں کے

سامنے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یقیناً کوئی خاص بات تھی۔

دفعتاً بشارت کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کیا سنیتا اسے بلیک میل کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتی؟ مگر بشارت نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ بشارت جیب تراش اور اچکا ہے۔ بلیک میل کر کے اسے کیا ملے گا اور اگر بلیک میل کرنا ہی ہوتا تو اسے ساتھ لانے کی بجائے خاموشی سے اس کا پیچھا کرتی اور اس کا ٹھکانہ معلوم کر لینے کے بعد پس پردہ رہ کر اس سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ کرتی۔

بشارت اس حسین عورت سنیتا کے بارے میں بھی کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جوان اور حسین تھی۔ اتنے بڑے مکان میں اکیلی رہتی تھی اور بڑی شاہانہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کے لباس اور انداز گفتگو سے بھی بشارت نے اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو.....؟" سنیتا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ۔ کچھ نہیں۔" بشارت گڑبڑا سا گیا۔ "میں سوچ رہا ہوں اب مجھے چلنا چاہئے۔ تم نے مجھے پولیس سے بچا کر جو احسان کیا ہے میں اسے زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔"

"میں نے تم پر اگر کوئی احسان کیا ہے تو اسے مٹی میں ملا دینا چاہتے ہو۔" سنیتا نے اسے گھورا۔

"میں سمجھا نہیں۔" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بیوقوف آدمی۔" سنیتا اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ پولیس والے گھر جا کر آرام سے سو گئے ہوں گے۔ بھلے آدمی اس وقت تمہارا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ لباس تو تم نے بدل ہی لیا ہے' ہو سکتا ہے کسی نے پولیس کو تمہارا مکمل حلیہ بھی بتا دیا ہو۔ وہ آدمی آخری وقت تک وہاں موجود رہا تھا جس سے چرمی بیگ چھینا گیا تھا۔ اس نے تمہیں اچھی طرح دیکھا ہو گا۔"

بات غلط نہیں تھی۔ گرے سفاری سوٹ والا فائرنگ ہونے پر اگرچہ ایک کار کے پیچھے چھپ گیا تھا لیکن اس نے بشارت کو اچھی طرح دیکھا ہو گا۔

"ایک منٹ۔" سنیتا کہتے ہوئے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی میں چند منٹ

سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ سیاہ چرمی بیگ اس نے ہاتھ میں لٹکا رکھا تھا۔ قریب آ کر اس نے بیگ بشارت کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"اس بیگ کے لئے تین قتل ہوئے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کیا ہے۔ کھول کر دیکھو تو پتہ چل جائے گا کہ تمہارے دوست نے اپنی جان کیوں ضائع کی تھی۔"

بشارت نے بیگ اٹھالیا۔ سنیتا بھی اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ بشارت نے آہستہ آہستہ بیگ کی زپ کھولی اور پھر وہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ بیگ میں ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو روپے والے نوٹوں کے بنڈل بھرے ہوئے تھے۔ ان میں ایک سرخ بنڈل بھی تھا سو روپے کے نوٹوں والا۔ بشارت بنڈل نکال کر میز پر رکھنے لگا۔

سنیتا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بنڈل اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ہر بنڈل پر بنک کی مہر لگی ہوئی تھی۔ سو والے نوٹ نئے تھے جبکہ ہزار اور پانچ سو والے پرانے اور استعمال شدہ نوٹ تھے۔

"چار لاکھ ساٹھ ہزار روپے۔" سنیتا کے لہجے میں حیرت تھی۔ اس نے تمام بنڈل ایک طرف رکھ دیئے تھے۔ "تمہارے دوست کی زندگی کی قیمت!"

بشارت کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ نوٹوں کے بنڈلوں کو دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے رقم بینک سے نکلوائی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے شکرا اس وقت آس پاس ہی موجود ہو اور اس نے اس شخص کو یہ رقم لے کر بینک سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور اس کے پیچھے لگ گیا ہو۔ شکرے نے بہت بڑا ہاتھ مارا تھا لیکن خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

سنیتا اس سے بیگ لے کر اس کی مزید تلاشی لے رہی تھی لیکن بیگ میں اور کچھ نہیں تھا۔ کوئی ایسا کاغذ یا کوئی اور چیز بھی نہیں نکلی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہو کہ جس شخص نے یہ رقم بینک سے نکلوائی تھی وہ کون ہے۔ اس نے تمام بنڈل اٹھا کر دوبارہ بیگ میں ڈال دیئے اور بیگ بشارت کے سامنے رکھ دیا۔

"وہ تمہارا دوست تھا جو اس کے لئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس لئے اس رقم پر اب صرف تمہارا حق ہے۔"

بشارت چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر سنیتا کے دل میں لالچ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے حصہ بھی نہیں مانگا تھا۔

"وہ کون تھا؟" سنیتا نے پوچھا۔ "تم نے اسے بچانے کے لئے جس طرح اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ....."

"میرا دوست تھا۔ شکرا۔" بشارت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس سے میری بہت گہری دوستی ہو گئی تھی اور وہ مجھے سگے بھائیوں کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔"

"شاید بچپن کا دوست تھا۔" سنیتا بولی۔

"نہیں۔ اس سے میری پہلی ملاقات جیل میں ہوئی تھی۔" بشارت نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے اپنے اور شکرے کے بارے میں تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "میں وہ تو نہیں بن سکا جو بننا چاہتا تھا۔ اگر شکرے سے میری ملاقات نہ بھی ہوتی تو بھی شاید میں یہی کچھ کرتا' چوری' رہزنی' جیب تراشی' کیونکہ جیل سے نکلنے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ مجھ جیسے لاوارث اور بے سہارا لوگ چور' ڈاکو اور قاتل تو بن سکتے ہیں' اقبال نہیں بن سکتے۔"

"بہت افسوس ہوا تمہاری کہانی سن کر۔" سنیتا کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ "تو تمہاری بہن کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چلا۔"

"نہیں۔ وہ نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہو گی۔" بشارت کی آواز رندھ گئی۔

"میں اسے تمہارے ساتھ مل کر تلاش کروں گی۔ مجھے یقین ہے ایک نہ ایک دن وہ مل جائے گی۔" سنیتا نے کہا۔

"تم.....؟" بشارت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اب ہمارا تمہارا تو لمبا ساتھ رہے گا۔" سنیتا نے معنی خیز لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کھڑی ہو گئی۔ "دو بج رہے ہیں' بھوک لگ رہی ہے۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔ تم بھی منہ ہاتھ دھو لو۔ آؤ میں تمہیں باتھ روم دکھا دوں اور یہ بیگ یہاں سے اٹھا لو۔"

بشارت اس کے ساتھ ایک شاندار بیڈ روم میں آ گیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ میں استعمال ہونے والی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ بشارت نے بیگ وہیں رکھ دیا اور سنیتا کا بتایا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

باتھ روم بھی شاندار تھا۔ فرش ماربل کے ٹکڑوں کا تھا اور دیواروں پر پانچ فٹ کی بلندی تک خوبصورت ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار پر شیشے کے کیبنٹ میں کریمز اور

لوشن کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف کھونٹی پر شب خوابی کا خوبصورت زنانہ لباس اور زیر جامے وغیرہ ٹنگے ہوئے تھے۔

بشارت نے سرخ ٹی شرٹ اتار کر اپنی بنیان بھی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی اور سرخ ٹی شرٹ دوبارہ پہن لی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور باتھ روم سے باہر آ گیا۔

سنیتا میز پر کھانا لگا رہی تھی اور پھر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گفتگو کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بشارت کو کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ سنیتا وہ نہیں ہے جو اس نے اپنے آپ کو ظاہر کیا تھا۔

کھانے کے بعد وہ ہال کمرے میں بھی صوفے پر بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بشارت پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے۔" سنیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہے تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

سنیتا اسے اسی بیڈ روم میں لے آئی۔ وہ چرمی بیگ اب بھی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔

"تم یہاں سو جاؤ۔ میں اتنے میں گھر کے چھوٹے چھوٹے کام نمٹا لوں گی۔" سنیتا نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

بشارت کو ایک دم نیند کے جھونکے آنے لگے تھے۔ وہ کچھ کہے بغیر بستر پر گر گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ چار لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم اس بیگ میں موجود تھی۔ اس رقم کے لئے تین قتل ہو چکے تھے۔ سنیتا کی نیت بدل سکتی تھی۔ وہ اس رقم پر قبضہ کرنے کے لئے اسے سوتے میں قتل بھی کر سکتی تھی لیکن پوری شدت سے حملہ آور ہونے والی نیند نے اسے کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

☆=====☆=====☆

جب وہ بیدار ہوا تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سنیتا ہال کمرے میں بیٹھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

"میں نے باتھ روم میں کپڑے رکھ دیئے ہیں۔ تم نہا کر کپڑے بدل لو۔ میں چا۔

بنانے جا رہی ہوں۔" سنیتا کتاب ایک طرف رکھ کر اٹھ گئی۔

بشارت دوبارہ اس کمرے کے باتھ روم میں گھس گیا۔ کھونٹی پر پہلے پہنے ہوئے شرٹ اور جینز کی ایک پینٹ ٹنگی ہوئی تھی۔ اس نے دوپہر کو اپنی جو بنیان ٹانگی تھی وہ غائب تھی۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے اس کی ساری کسلمندی دور ہو گئی۔ اس نے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑے پہن لئے۔ پینٹ اسے اس طرح فٹ آئی تھی جیسے اسی کے لئے بنوائی گئی ہو۔ وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو سنیتا بھی کچن سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سنیتا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ اس نے چائے کے برتن میز پر لگا دیئے۔ چائے پینے کے فوراً ہی بعد بشارت اٹھ گیا۔

"میں تمہاری ہمدردی کا شکریہ اور ادا نہیں کروں گا کہ اس سے تمہارے جذبات کی توہین ہو گی۔" وہ سنیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اب جانا چاہوں گا۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"کیا باہر نکلنا مناسب ہو گا؟" سنیتا نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"میں یہاں چھپ کر تو بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ باہر نکلنا ہی ہو گا۔ ویسے بھی اب تلاش کا ہنگامہ سرد پڑ چکا ہو گا۔"

"سوچ لو کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔" سنیتا نے کہا۔

"رسک تو لینا ہی پڑے گا۔" بشارت نے جواب دیا۔

سنیتا چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کمرے سے چلی گئی۔ واپس آئی تو اس نے براؤن کلر کا ایک بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ جو اس نے بشارت کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم یہاں نہیں رکو گے۔" سنیتا نے کہا۔ "وہ سیاہ چرمی بیگ لے جانا مناسب نہیں ہو گا۔ اس لئے میں نے وہ رقم اس میں ڈال دی ہے۔ اپنا اطمینان کر لو۔" اس نے بریف کیس کھول دیا۔ اس میں نوٹوں کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔

"یہ لوٹ کا مال ہے۔" بشارت نے کہا۔ "تم مجھے اس خطرے سے نکالا تھیں اس لئے اصولی طور پر اس پر تمہارا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ اگر تم چاہ

رقم....."

"میں اگر چاہتی تو پوری رقم پر قبضہ کر سکتی تھی۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے دل میں کوئی لالچ نہیں ہے۔ یہ رقم تمہاری ہے اور اپنا خیال رکھنا۔ کوئی پرابلم محسوس کرو تو بے دھڑک چلے آنا۔ اس گھر کا دروازہ تمہیں ہمیشہ کھلا ملے گا۔ چلو۔ تمہیں گاڑی پر چوک تک چھوڑ دوں۔ وہاں سے تمہیں کوئی ٹیکسی وغیرہ مل جائے گی۔"

اس کے تقریباً بیس منٹ بعد بشارت وہ براؤن بریف کیس لئے چوک پر سنیتا کی کار سے اتر رہا تھا۔ اسے اتارنے کے بعد سنیتا وہاں رکی نہیں۔ گاڑی کو ایک طرف لیتی چلی گئی۔

دو منٹ بعد ہی بشارت کو رکشہ مل گیا۔ اس کے خیال میں رکشہ ٹیکسی سے زیادہ مناسب تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے شخص کو باہر سے دیکھا جا سکتا تھا جبکہ رکشا کے ریگزین کے اسپرنگ والے دروازے بند ہو جاتے تو باہر سے رکشے میں بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھنا ممکن نہ تھا۔

لکشمی چوک سے اس نے رکشہ نسبت روڈ کی طرف مڑوا لیا اور کچھ آگے جا کر ایک نسبتاً تاریک جگہ پر رکشہ رکوا لیا۔ کرایہ ادا کیا اور محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے چلنے لگا۔

استاد گنگو کے ڈیرے والی گلی میں مڑتے ہوئے بھی اس نے محتاط نگاہوں سے اطراف میں دیکھا تھا۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ اس وقت اڈے پر کوئی نہ کوئی لڑکا موجود رہتا تھا لیکن اس وقت سناٹا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ احاطے کے وسط میں لکڑی کے پول پر شام کے بعد ساٹھ واٹ کا ایک بلب جلتا رہتا تھا لیکن بلب تو فیوز ہو گیا تھا یا کسی نے جلایا نہیں تھا۔ کمرے کی بتی بھی بجھی ہوئی تھی اور کسی گھوڑے کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ حالانکہ شام کے بعد دو تین کوچوان اپنے تانگے کھول کر گھوڑے باندھ جایا کرتے تھے۔

بشارت کی چھٹی حس اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی لیکن وہ آگے بڑھتا رہا۔

"کون ہے بھئی؟" چاچا جانو کی جانی پہچانی سی آواز تاریکی میں ابھری۔ وہ گھوڑوں کو

چارہ وغیرہ کھلایا کرتا تھا اور کوچوان اسے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے تھے۔

"میں ہوں چاچا۔ بشارت۔" بشارت نے جواب دیا۔

چاچا جانو تیزی سے اس کے قریب آ گیا۔

"بشارت بیٹے۔ بھاگ جا یہاں سے۔ تھوڑی دیر پہلے پولیس تمہاری تلاش میں آئی تھی۔ یہاں دو لڑکے تھے انہیں پکڑ کر لے گئے۔ وہ لوگ آس پاس ہی کہیں موجود ہوں گے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔" جانو چاچا نے سرگوشی میں کہا۔

بشارت تیزی سی مڑا لیکن ٹھیک اسی لمحہ ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ گولیوں سے چھلنی ہو جاؤ گے۔"

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دماغ سن ہو گیا۔ اور پھر دفعتاً اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کسی ٹارچ کی تیز روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو اور اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔" وہی گونج دار آواز دوبارہ سنائی دی۔

بشارت دونوں ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں بریف کیس بھی موجود تھا۔ اس صورت حال سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ پولیس کو معلوم تھا کہ وہ یہاں آنے والا ہے۔ مگر پولیس کو یہ اطلاع کس نے دی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی نام ابھرا تھا۔

"سنیتا..... اس کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ صرف سنیتا ہی جانتی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے فون پر پولیس کو اطلاع دے دی۔

شدید نفرت کے باعث بشارت کے چہرے کے تاثرات بگڑتے چلے گئے اور وہ اس پولیس والے کی طرف دیکھنے لگا جو اس پر ریوالور تانے آگے بڑھ رہا تھا اور دوسرے پولیس والے نے اسے ٹارچ کی روشنی کی زد میں لے رکھا تھا۔

☆==========☆==========☆

ٹارچ کی روشنی صرف ایک لمحے کو بشارت کے چہرے سے ہٹی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ "اب یا کبھی نہیں۔" اور پھر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں اس نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس کا بریف کیس والا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔

بریف کیس اس پولیس والے کے ہاتھ پر لگا جس نے اس پر پستول تان رکھا تھا۔ قانون کا وہ محافظ اس ردعمل کے لئے تیار نہیں تھا۔ بریف کیس بڑے زور سے اس کے ہاتھ پر لگا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گندی گالی نکل گئی تھی۔

بشارت نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ ایک پولیس والے پر بریف کیس سے حملہ کرنے کے ساتھ ہی اس کی لات بھی حرکت میں آگئی تھی۔ پیر میں نوکدار جوتے کی ٹھوکر اس پولیس والے کی پنڈلی پر لگی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کے ہاتھ سے ٹارچ بھی گر گئی اور وہ ایک ٹانگ پر ناچنے لگا۔ اس کے منہ سے بھی غلیظ گالیوں کا گڑاہل پڑا تھا۔

ٹارچ لید کے ڈھیر پر گری تھی اور اس کی روشنی اس پستول پر پڑ رہی تھی جو پہلے پولیس والے کے ہاتھ سے نکل کر ایک تانگے کے پہیئے کے قریب گرا تھا۔ روشنی میں پستول نظر آتے ہی اس پولیس والے نے اس طرف چھلانگ لگادی لیکن بشارت بھی حرکت میں آچکا تھا۔ اس کے پیر کی زوردار ٹھوکر سامنے سے پولیس والے کے کندھے پر لگی۔ وہ پیچھے کو الٹ گیا۔ اس کا سر بڑے زور سے تانگے کے پہیئے سے ٹکرایا تھا۔ وہ اس طرح گرا تھا کہ اس کے شولڈر پر لگا ہوا ایک اسٹار ٹارچ کی روشنی میں چمکنے لگا تھا۔

اس دوران میں دوسرا پولیس والا سنبھل چکا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا بشارت پر حملہ آور ہوا۔ اس کی دہاڑ بشارت کے لئے وارننگ ثابت ہوئی۔ اس کا بریف کیس والا ہاتھ بجلی کی

سے تیزی سے حرکت میں آیا۔ بریف کیس اس پولیس والے کے منہ پر لگا اور وہ ایک بار پھر بلبلاتا ہوا بائیں طرف کھڑے ہوئے دوسرے تانگے سے ٹکرا کر گر گیا۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر گندگی کا گڑاہلنے لگا تھا۔

بشارت نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس نے دونوں پولیس والوں کو وقتی طور پر مفلوج کر دیا تھا لیکن اس بات کا سو فیصد امکان تھا کہ باہر بھی ان کے کچھ ساتھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے ان کے چیخنے کی آوازیں بھی سنی ہوں گی اور وہ کسی بھی لمحے اندر آسکتے تھے۔ یا یہ دونوں سورے اس پر دوبارہ حملہ آور ہوسکتے تھے۔ اب یہاں رکنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس نے جانو چاچا کی طرف دیکھا جو ایک طرف کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"جانو چاچا بھاگو....." بشارت نے چیختے ہوئے ایک طرف چھلانگ لگادی۔

جانو چاچا بھی اس کے پیچھے ہی دوڑا تھا۔ ان دونوں کا رخ طویلے کے گیٹ کی طرف تھا لیکن بشارت کا گیٹ کے راستے باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ گیٹ کے باہر سے بھی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ رک گیا۔ اس کے پیچھے آنے والا جانو چاچا بدحواسی میں اس سے ٹکرا گیا اور اس ٹکر سے بشارت گرتے گرتے بچا تھا۔

"جانو چاچا۔ بھاگو اس طرف۔" بشارت نے چیختے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا جہاں تین چار ناکارہ تانگے کھڑے تھے۔

"میں تو اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ تُو بھاگ جا پتر۔ میں ان پولیس والوں کو یہیں روکنے کی کوشش کروں گا۔" جانو چاچا نے کہا۔

اس سے پہلے کہ بشارت کچھ کہتا' فضاء فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی جانو چاچا کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ یہ گولی اس اے ایس آئی نے چلائی تھی جسے بشارت نے ٹھوکروں سے بے بس کر کے گردیا تھا۔ وہ گولی جانو چاچا کی پشت پر لگی تھی۔ اگر جانو چاچا وہاں نہ ہوتا تو بشارت اس گولی کا نشانہ بنتا۔

جانو چاچا کو سنبھالنے یا دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ بشارت نے بائیں طرف ایک تانگے کے پیچھے چھلانگ لگادی اور تاریکی میں دوڑتا چلا گیا۔ احاطے کی اس دیوار کے قریب گھوڑوں کو پانی پلانے کے لئے حوضی سی بنی ہوئی تھی۔ بشارت اس حوضی پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا ہی رہا تھا کہ فضاء ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی

بشارت کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر لگی۔ یکے بعد دیگرے دو اور فائر ہوئے مگر بشارت دیوار سے کود چکا تھا۔

اس دیوار کے دوسری طرف بھی ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جس پر طویل عرصے سے کسی کباڑیئے نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اس احاطے میں جگہ جگہ کباڑ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ بشارت بکھرے ہوئے کباڑ سے بچتا ہوا گیٹ کی طرف دوڑا۔ احاطے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ لوہے کے تاروں والا اونچا گیٹ بند تھا۔ بشارت گیٹ پر چڑھ رہا تھا کہ بریف کیس ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اس نے نیچے اتر کر بریف کیس اٹھایا اور دوبارہ گیٹ پر چڑھنے لگا۔

طویلے کی طرف سے پولیس والوں کے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگانے سے پہلے بشارت نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے طویلے کی دیوار پر ایک انسانی ہیولہ نظر آیا جس نے اسی وقت احاطے کی طرف چھلانگ لگادی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ اور ٹین کے بہت سارے خالی ڈبوں کے لڑھکنے کا شور سنائی دیا۔ دیوار سے چھلانگ لگانے والا خالی ڈبوں کے ڈھیر پر گرا تھا۔

بشارت نے گیٹ سے چھلانگ لگادی اور گلی میں سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ سڑک پر روشنی تھی اور ٹریفک کی آمدورفت جاری تھی مگر زیادہ رش نہیں تھا۔

بشارت نے رک کر دائیں طرف دیکھا۔ طویلے والی گلی کے سامنے سڑک کے دوسری طرف پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور دو پولیس والے رائفلیں سنبھالے طویلے کی طرف دوڑ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی گلی میں داخل ہوئے' بشارت نے بائیں طرف دوڑ لگادی۔

اس نے ابھی تقریباً بیس گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے قریب رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی کا پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھل گیا اور ایک جانی پہچانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"اندر بیٹھو۔ جلدی کرو....."

یہ آواز بشارت کے لئے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ سنیتا ہی تھی جس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے

اسے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

"تم....." بشارت نے دانت کچکچائے۔ "تم ہی ان لوگوں کو یہاں لے کر آئی ہو۔ کاش! میرے پاس پستول ہوتا تو اس کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دیتا۔"

"کیا بک رہے ہو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ جلدی۔" سنیتا نے کہتے ہوئے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

"اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم میرے ساتھ اس طرح دھوکا کرو گی تو میں تمہارے گھر میں ہی تمہارا گلا گھونٹ دیتا۔" بشارت غرایا۔ "پہلے پولیس کو یہاں لے کر آئیں اور جب دیکھا کہ میں بچ کر نکل رہا ہوں تو اس طرح مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"اوہ!" سنیتا بولی۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ بشارت' جلدی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔ پولیس والے گلی سے نکل رہے ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو تمہیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔ کار میں بیٹھو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ جلدی کرو۔"

بشارت کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جو پولیس والے دوڑتے ہوئے طویلے والی گلی میں گئے تھے' وہ دونوں واپس آگئے تھے۔ ان میں سے ایک تو سڑک کے دوسری کھڑی ہوئی موبائل کی طرف دوڑ گیا اور دوسرا وہیں رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بشارت مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے بریف کیس گود میں رکھ لیا۔ سنیتا نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

"تم نے یہ سب کیوں کیا۔" بشارت نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیوں کیا؟"

"ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔" سنیتا نے عجیبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "پولیس کی گاڑی اسی طرف مڑ رہی ہے۔ اور دوسری گلی سے بھی پولیس والے باہر آرہے ہیں جہاں سے تم آئے تھے۔ اس وقت تم خاموشی سے بیٹھے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری باتوں سے بدحواس ہو کر میں کسی تانگے یا گاڑی کو ٹکر ماردوں۔"

بشارت اسے گھور کر رہ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی گاڑی اس گلی کے سامنے رک گئی تھی جہاں سے وہ خود باہر آیا تھا۔ وہاں سے اس وقت تین پولیس والے تھے۔ دو اچک کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان میں سے ایک ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دوسرا پچھلے حصے میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑی بڑی تیزی سے حرکت میں آئی تھی۔ سنینا نے بھی کار کی رفتار بڑھادی۔

بشارت سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پولیس کی گاڑی کو پیچھے آتے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس نے ان کی کار روک لی اور اسے شناخت کر لیا گیا تو اس کے بچنے کے امکانات ایک فیصد بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ سنینا کی طرف سے بھی وہ شکوک و شبہات میں مبتلا تھا۔ سنینا کی یہاں موجودگی اس کے لئے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ پیدل ہوتا تو تاریک اور تنگ گلیوں میں غائب ہو جاتا لیکن کار میں بیٹھ کر اس کے فرار ہونے کے امکانات بھی محدود ہو گئے تھے۔

اس کی نظریں گود میں رکھے ہوئے بریف کیس پر پڑیں تو وہ اچھل پڑا۔ گولی لگنے سے بریف کیس میں سوراخ ہو گیا تھا۔ اس نے بریف کیس اٹھا کر فٹ میٹ پر رکھ کر اوپر پیر رکھ دیئے۔

پولیس موبائل کے ڈرائیور نے سائرن کھول دیا تھا اور وہ گاڑی کو آگے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف سے ٹریفک کی آمدورفت کی وجہ سے اوور ٹیک کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ تانگوں کی وجہ سے تو ٹریفک میں اور بھی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں سنینا کی کار کے آگے بھی دو تانگے تھے جس وجہ سے وہ اپنی کار کی رفتار بھی نہیں بڑھا پا رہی تھی۔ پولیس موبائل اس کے پیچھے تھی۔

پولیس موبائل کسی طرح آگے نکل کر سنینا کی کار کے برابر آگئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ہیڈ کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سنینا کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

"کار کو سائیڈ پر ہٹاؤ۔ چلانا نہیں آتی تو گاڑی لے کر گھر سے نکلتی کیوں ہو۔"

"ان تانگوں کو سامنے سے ہٹاؤ میں تمہارے ساتھ ریس کرنے کو تیار ہوں۔" سنینا نے بھی اس کی طرف دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔

موبائل کا ڈرائیور اونچی آواز میں تانگے والوں کو گالیاں بکنے لگا۔ اگرچہ سائرن بج رہا

تھا مگر وہ بار بار ہارن بھی بجا رہا تھا۔

بشارت نے ذرا سی گردن گھما کر دیکھا۔ ڈرائیور کے ساتھ دوسری طرف ایک اے ایس آئی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے شولڈر پر لگا ہوا اسٹارڈیش بورڈ کے ڈاکلٹر کی مدھم سی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بشارت کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔ یہ اے ایس آئی یقیناً وہی تھا جس سے احاطے میں دوبدو مقابلہ ہوا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں بشارت کا چہرہ بھی دیکھا تھا اور بشارت سوچ رہا تھا کہ اگر اس اے ایس آئی نے اس طرف دیکھ لیا تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس نے سنینا کی طرف دیکھے بغیر بہت مدھم لہجے میں کہا۔

"موبائل میں بیٹھا ہوا اے ایس آئی طویلے میں میرا چہرہ دیکھ چکا ہے۔ کار کو آگے نکالنے کی کوشش کرو۔"

سنینا نے کار کو بڑی آہستگی سے گھما دیا اور ایک تانگے سے آگے نکال کر اسے تیزی سے اس طرح گھمایا کہ کار کا پچھلا حصہ گھوڑے کی ٹانگ پر لگا۔ گھوڑا بدک گیا اور ہنہناتے ہوتے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ کوچوان نے جلدی سے چھلانگ لگا دی اور منہ کے قریب سے راس پکڑ کر گھوڑے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورتیں خوف سے چیخنے لگیں۔

گھوڑا بدک چکا تھا اور آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ تانگہ سڑک پر آڑا ترچھا ہو گیا جس سے پیچھے آنے والی موبائل اور دوسرے ٹریفک کو بھی رکنا پڑا۔

سنینا نے سامنے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ بشارت بھی اس کی ذہانت پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

آگے میو اسپتال سے ذرا پہلے ایک چھوٹا سا چوراہا تھا۔ سنینا نے کار اس چوراہے سے بائیں طرف موڑلی۔ یہ تنگ سی سڑک تھی۔ دونوں طرف دکانیں تھیں اور ٹریفک بھی زیادہ تھا۔ کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ سنینا کی توجہ ڈرائیونگ پر تھی جبکہ بشارت بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ یہ تنگ سی سڑک نیم دائرے کی صورت میں گھومتی ہوئی اس سڑک سے جا ملتی تھی جو میو اسپتال کے گیٹ کی طرف سے آتی ہوئی میکلوڈ روڈ کو کراس کر کے کیتھڈرل چرچ کے قریب ہال روڈ سے جا ملتی تھی لیکن میکلوڈ روڈ سے کچھ پہلے دائیں

طرف ایک اور چھوٹی سڑک بھی ملتی تھی جو تھوڑا ہی آگے جا کر مال روڈ سے مل جاتی تھی۔ سنیتا نے کار اس سڑک پر موڑلی تھی۔ مال روڈ پر پہنچ کر اس نے کار دائیں طرف موڑلی۔ بشارت نے اس وقت بھی ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ پولیس کو تو مجھے ان ہی گلیوں میں تلاش کرنا چاہئے تھا۔ موبائل میو اسپتال کی طرف کیوں آئی تھی جبکہ میں نے انہیں جانو چاچا کو بھی گاڑی میں ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔"

"جانو چاچا کون؟" سنیتا نے پوچھا۔

"طویلے میں رہتا تھا۔ اسے گولی لگی تھی۔ پتہ نہیں وہ زندہ بچا ہے یا مرگیا ہے۔" بشارت نے کہا۔ "لیکن پولیس کی گاڑی اس طرف کیوں آئی تھی؟"

"میرے خیال میں وہ اس پورے علاقے کی ناکہ بندی کرنا چاہتے ہوں گے۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ پولیس کی وہ گاڑی میو اسپتال سے پہلے اس چھوٹے چوک پر رک گئی ہوگی اور وائرلیس پر آس پاس کے علاقوں میں موجود دوسری گشتی گاڑیوں کو بھی اطلاع کردی گئی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ لکشمی چوک کی طرف سے بھی اس علاقے کی ناکہ بندی کردی گئی ہوگی۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔" بشارت نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "تم نے میرے بارے میں پولیس کو اطلاع دی تھی۔ پھر مجھے وہاں سے بچا کر کیوں نکال لائی ہو؟ کیا چاہتی ہو تم..... کون سا کھیل کھیل رہی ہو میرے ساتھ؟"

"کھیل!" سنیتا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ الزام تم پہلے بھی لگا چکے ہو کہ پولیس کو اس طویلے میں تمہاری موجودگی کی خبر میں نے دی تھی لیکن مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تمہیں اس وقت پولیس کے ہاتھ لگنے سے بچایا تھا جب وہ تمہارے گرد گھیرا تنگ کرچکے تھے۔ بات زیادہ پرانی تو نہیں۔ آج دوپہر سے پہلے ہی کا تو واقعہ ہے۔ اگر میں رنگ محل کے قریب سے تمہیں اپنی کار میں بٹھا کر نہ لے جاتی تو تم پکڑے جاچکے ہوتے اگر مجھے پولیس سے کچھ انعام لینا ہی تھا تو تمہیں بڑے اطمینان سے اس چوکی پر پولیس کے حوالے کردیتی جہاں گاڑیوں کی چیکنگ ہو رہی تھی لیکن پولیس کو کسی شبہے کا موقع دیئے بغیر میں وہاں سے بھی تمہیں نکال لے گئی۔ تم سارا دن میرے گھر

پر رہے۔ کئی گھنٹوں تک غفلت کی نیند سوئے رہے۔ تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے کی رقم بھی عملی طور پر میرے قبضے میں تھی۔ میں اگر چاہتی تو بڑے اطمینان سے تمہیں پولیس کے حوالے کردیتی اور وہ گرانقدر رقم بھی اپنے پاس رکھ لیتی۔ تم کیا بگاڑ لیتے میرا؟"

"لیکن پولیس کو میرے بارے میں اطلاع کس نے دی اور وہاں تمہاری موجودگی۔ اسے میں کیا سمجھوں؟" بشارت نے کہا۔

"اوہ!" سنیتا کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "اس لئے تم مجھ پر شبہ کررہے ہو؟"

"اس کے علاوہ شبہے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" بشارت نے کہا۔ "تم واحد ہستی ہو جسے معلوم تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں اور جب میں وہاں پہنچا تو پولیس میری منتظر تھی۔"

"میں بتاتی ہوں کہ میں وہاں کیوں موجود تھی۔" سنیتا نے کہا۔ "جب تم اپنے ڈیرے پر آنے کے لئے میری گاڑی سے اتر کر رکشے میں بیٹھے تو ایک اور آدمی کو دوسرے رکشے پر تمہارے پیچھے روانہ ہوتے دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا۔ وہ اگرچہ سادہ لباس میں تھا مگر شکل سے پولیس والا ہی لگتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ اس لئے میں نے تمہارا تعاقب شروع کردیا۔ اس شخص پر میرا شبہ غلط نکلا۔ وہ رکشہ بھاٹی چوک سے چوبرجی کی طرف جانے والی سڑک پر مڑگیا تھا۔ مجھے مطمئن ہو کر واپس چلے جانا چاہئے تھا لیکن میں نے تمہارا تعاقب جاری رکھا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں کیا؟" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تم نے بتایا تھا کہ تمہارا ڈیرہ نسبت روڈ پر لکشمی چوک سے ذرا ہی آگے ہے۔ لکشمی چوک سے نسبت روڈ پر مڑ کر چند گز کا فاصلہ طے کرکے میں نے کار روک لی۔ اس وقت ٹریفک بھی زیادہ تھا لیکن میں نے تمہارے رکشے کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

"تمہارا رکشہ تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے جاکر رک گیا اور تم اتر کر اس گلی میں داخل ہوگئے۔ میں تین چار منٹ تک وہاں کھڑی رہی اور پھر انجن اسٹارٹ کردیا تھا۔ میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلارہی تھی۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ تم خطرے میں تھے مگر میری

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمہیں خطرے سے کس طرح آگاہ کروں یا تمہاری کس طرح مدد کروں۔ اور پھر گولی چلنے کی آواز سن کر میں دہشت زدہ سی ہوگئی۔ اس کے فوراً ہی بعد میں نے دو اور پولیس والوں کو دوڑتے ہوئے اس گلی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ گولی یقیناً کسی پولیس والے نے چلائی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد یکے بعد دیگرے تین اور فائر ہوئے۔ میرے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمہاری فاتحہ پڑھ لینی چاہئے یا کسی بہتری کی امید رکھنی چاہئے۔

"اور پھر میں نے تمہیں آگے والی گلی سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس جگہ اگرچہ کچھ اندھیرا تھا لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا۔ تم مخالف سمت میں دوڑے تھے۔ میں نے بھی گاڑی تیزی سے دوڑا دی اور اس سے پہلے کہ پولیس والے گلی سے نکل کر تمہیں گولیوں سے بھون دیتے' میں تم تک پہنچ گئی۔" سنینا ایک بار چند لمحوں کو خاموش ہوگئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے اپنی جان تمہارے لئے خطرے میں ڈالی تھی۔ اگر پولیس والے تمہیں میری گاڑی میں بیٹھتے دیکھ لیتے تو تمہارے ساتھ میں بھی ماری جاتی۔ میں نے تو تمہیں بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگادی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہیں پکڑوانے کے لئے پولیس میں مخبری کی تھی!"

"سوری سنینا۔" بشارت کے لہجے میں معذرت تھی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں سے تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچی لیکن میں جس ذہنی کرب میں مبتلا تھا اس کا تم اندازہ لگا سکتی ہو۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ میں تمہارے سوا کسی اور پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال' مجھے افسوس ہے لیکن اس بات پر بھی حیرت ہے کہ پولیس کو میرے بارے میں اطلاع کس نے دی تھی۔"

"تمہارا وہ ڈیرہ کوئی عبادت گاہ نہیں ہے۔ جیب تراشوں اور جرائم پیشہ لوگوں کا اڈا ہے۔" سنینا نے کہا۔ "پولیس کا وہاں چھاپہ مارنا کوئی حیرت کی بات تو نہیں۔ ایسے اڈے پولیس کی نظروں میں رہتے ہیں۔ بھتہ وصول کرتے ہیں وہ لوگ۔ ہو سکتا ہے پولیس اس سلسلے میں وہاں آئی ہو۔ یا اس علاقے میں کوئی بڑی واردات ہوگئی ہو۔ ایسی صورت میں پولیس سب سے پہلے علاقے کے بدنام اور جرائم پیشہ لوگوں کو پکڑتی ہے۔"

"نہیں!" بشارت نے نفی میں سرہلایا۔ "ہم بھتہ ضرور دیتے ہیں لیکن پولیس نے

اس طرح ڈیرے پر کبھی ریڈ نہیں کیا اور پھر چاچا جانو! اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا تھا کہ پولیس میری تلاش میں آئی تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں رات کو ڈیرے پر نہیں جاتا کہیں اور سوجاتا ہوں' لیکن آج پولیس کو یہ اطلاع تھی کہ میں وہاں آؤں گا۔ انہیں وقت کا بھی اندازہ تھا اور وہ لوگ میرے انتظار میں تھے۔"

"تو پھر معلوم کرو تمہاری مخبری کس نے کی تھی۔ وہ کون تھا جو تمہارے پروگرام سے واقف تھا؟" سنینا نے کہا۔

"تم.....؟" بشارت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "معاف کرنا سنینا۔ میرے پروگرام سے تو صرف تم ہی واقف تھیں لیکن..... سب کچھ جاننے کے بعد میں تمہیں الزام نہیں دوں گا لیکن..... لیکن میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھا ہوا ہے۔"

"بہتر یہی ہے کہ اس وقت تم بالکل مت سوچو۔" سنینا نے کہا۔ گاڑی اس وقت مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی داتا دربار سے آگے نکل کر راوی روڈ پر پہنچ چکی تھی۔ "دماغ پر بوجھ بالکل مت ڈالو۔ اس وقت جتنا سوچو گے اتنا ہی الجھتے جاؤ گے۔"

"اب ہم کہاں جارہے ہیں؟" بشارت نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کا ذہن واقعی الجھا ہوا تھا۔ اسے اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ کس طرف جارہے ہیں۔

"گھر..... اور کہاں!" سنینا نے جواب دیا۔

"تمہارے گھر ہی کیوں؟" بشارت نے کہا۔ "مجھے کسی جگہ اتار دو۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں گا۔"

"اس وقت تمہارے لئے محفوظ ترین جگہ میرا گھر ہے۔" سنینا نے جواب دیا۔ "بھول گئے ہو کہ پولیس نے تمہاری تلاش میں اس اڈے پر چھاپہ مارا تھا اور وہاں ایک قتل بھی ہوگیا تھا۔ وہ قتل اگرچہ پولیس والے کے ہاتھوں ہوا تھا لیکن میں دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ قتل یا تو تمہارے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا یا اسے پولیس مقابلہ ظاہر کیا جائے گا۔ آئے دن لوگ ایسے "پولیس مقابلوں" میں مارے جاتے ہیں لیکن پولیس کو کبھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاتا۔ وہ قانون کے محافظ ہوتے ہیں' کسی بے گناہ کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار کر اسے مفرور قاتل' ڈاکو یا دہشت گرد ثابت کردینا پولیس کے لئے

ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔ جانو چاچا پولیس کے ہاتھوں مارا گیا مگر تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس تمہاری تلاش میں رات بھر چھاپے مارے گی۔ تمہارے لئے کوئی جگہ محفوظ نہیں ہو گی' سوائے میرے گھر کے۔"

بشارت جواب میں کچھ نہیں بولا۔ سنیتا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس کے جتنے بھی جاننے والے تھے' سب اس پیشے سے وابستہ تھے۔ جرائم پیشہ لوگ۔ جو پہلے ہی پولیس کی نظروں میں تھے۔ سب سے پہلے پولیس ایسی ہی جگہوں پر چھاپے مارے گی۔ کسی ہوٹل کا رخ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا اور پھر اس کے پاس ایک خطیر رقم بھی موجود تھی۔ یہ رقم بھی کسی کو اس کا دشمن بنا سکتی تھی۔ اس کے لئے واقعی کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ سنیتا کا مکان ہی اس کے لئے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔

☆———☆———☆

کار لیڈی ولنگڈن اسپتال کے ساتھ مڑ کر ٹکسالی دروازے میں داخل ہو گئی۔ دس اور گیارہ کے بیچ کا وقت تھا۔ آگے بازار حسن کے علاقے میں تو بڑی رونق تھی۔ ہر طرف سے طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ بازار حسن کے عین بیچ سے گزرنے والی اس سڑک پر رش تھا۔ دونوں طرف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ چھابڑی والے اور ہار پھول بیچنے والے بھی اپنی دکانیں سجائے ہوئے تھے جس سے سڑک کچھ اور تنگ ہو گئی تھی۔ کار کی رفتار بہت ہلکی تھی۔ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگ ہوس بھری نظروں سے سنیتا کو دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگوں نے سلگتے ہوئے جملے بھی کسے تھے۔ بشارت اپنی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا لیکن سنیتا کے چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہیں ہوا۔

"میں اس لئے شام کے بعد کبھی اس راستے سے نہیں آتی۔" سنیتا نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرف سے گزرنے والی ہر عورت طوائف ہے۔ ان کی ماں بہن کو کوئی دوسرا مرد ایسی نظروں سے دیکھ لے تو شاید....."

اس کا جملہ مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ ایک ہیرو ٹینچی اچانک ہی گاڑی کے سامنے آ کر گر گیا تھا اور اسے اچانک ہی بریک لگانی پڑی تھی۔

دو آدمیوں نے گاڑی کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر ہیرو ٹینچی کو گھسیٹتے ہوئے سڑک سے ہٹا کر ایک طرف ڈال دیا۔

"تم سمجھتے ہو یہ نشئی محض اتفاق سے گاڑی کے سامنے آیا ہو گا۔" سنیتا نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ اس نیت سے جان بوجھ کر سامنے آیا تھا کہ اسے گاڑی کی ٹکر لگے۔ اگر میری گاڑی اس کے کپڑوں کو بھی چھو جاتی تو چاروں طرف کھڑے ہوئے یہی لوگ گاڑی کو گھیر لیتے۔ سب لوگ اس نشئی کے ہمدرد بن جاتے اور مجھے سو پچاس روپے دے کر جان چھڑانا پڑتی۔"

بشارت نے گردن گھما کر سڑک کے کنارے پر پڑے ہوئے ہیرو ٹینچی کی طرف دیکھا۔ اس کا میلا چکٹ لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے اور الجھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں اور پیروں پر میل کے چکتے جمے ہوئے تھے' پیشانی' رخسار اور ٹھوڑی پر زخم کے نشان تھے جن پر خون جما ہوا تھا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور پچکے ہوئے گال۔ اس کا چہرہ زندگی کی ویرانی کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔

بشارت شہر کے مختلف علاقوں میں ایسے کئی لوگوں کو دیکھ چکا تھا جنہوں نے منشیات کی لعنت کو گلے کا طوق بنا لیا تھا اور اپنے آپ کو اس طرح بربادی کے دہانے پر پہنچایا تھا کہ ان کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔

مزید پندرہ منٹ بعد وہ گھر پہنچ گئے۔ کمرے میں آ کر بشارت نے اطمینان کا سانس لیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ بریف کیس کے دونوں طرف سوراخ تھا۔ گولی ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے بریف کیس سینٹر ٹیبل پر رکھ کر کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سنیتا بھی قریب کھڑی دیکھ رہی تھی۔ بشارت نے بریف کیس میں رکھے ہوئے سو سو والے نوٹوں کا ایک بنڈل اٹھا لیا۔ گولی نے نوٹوں کے اس بنڈل میں بھی سوراخ کر دیا تھا۔

سنیتا نے نوٹوں کا بنڈل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ "دس ہزار کے یہ نوٹ تو ضائع ہو گئے۔ سمجھو تمہاری جان کا صدقہ نکل گیا۔"

"صدقہ اپنی کمائی میں سے دیا جاتا ہے۔ لوٹ مار کی رقم میں سے نہیں۔" بشارت نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔" سنیتا نے کہا۔ "اب اگر تم منہ ہاتھ دھولو تو میں کچھ کھانے کا بندوبست کروں۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کچھ کھانے کو تو دل نہیں چاہتا۔ البتہ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔" بشارت نے بریف کیس بند کرتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پولیس کو اس کے بارے میں اطلاع کس نے دی تھی۔ اسے سنیتا پر شبہ تھا لیکن صورت حال کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سنیتا نے جو کچھ کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ سب سے پہلے اسی نے تو اسے پولیس سے بچایا تھا۔ اس کے بعد ہر لمحے اسے یہ موقع حاصل تھا کہ وہ اسے پولیس کے حوالے کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا کیوں کرتی۔ پولیس نے اس کی گرفتاری پر کوئی انعام تو مقرر نہیں کیا تھا جس کے لالچ میں وہ اسے پولیس کے حوالے کرتی' اور پھر اس کے پاس تو ساڑھے چار لاکھ سے زیادہ کی رقم موجود تھی۔ اسے کسی اور لالچ میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اسے اس بات کا یقین کرہی لینا پڑا کہ سنیتا نے اس کی مخبری نہیں کی تھی۔ اگر مخبری کی ہوتی تو وہ اسے بچانے کے لئے کیوں پہنچ جاتی۔

بشارت جب ٹھنڈے پانی سے نہاکر باہر نکلا تو اس کے دماغ کی گرمی کچھ کم ہوئی تھی۔ سنیتا اس وقت تک چائے کے ساتھ کچھ سینڈوچ بھی تیار کر چکی تھی۔ سینڈوچ کھانے اور چائے پینے کے بعد بھی وہ دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بشارت بار بار سنیتا سے یہی پوچھ رہا تھا کہ اسے اس سے ہمدردی کیوں ہے۔ دو مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسے پولیس سے کیوں بچایا۔ اس نے تو اب بھی اپنے آپ کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔ پولیس کو اگر کسی طرح پتہ چل جائے کہ سنیتا نے بشارت کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے تو پولیس کے عتاب سے وہ بھی نہیں بچ سکے گی۔ بشارت یہ بات کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سنیتا نے محض اپنی مہم جو فطرت اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی مدد کی تھی۔ ہمدردی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پہلی مرتبہ پولیس سے بچانے کے بعد اسے کسی محفوظ جگہ پر چھوڑ دینا چاہئے تھا لیکن وہ تو اس خطرے کو اپنے گھر میں لے آئی تھی۔

"تمہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آیا؟" سنیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں۔" بشارت نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "میں وہ مقصد جاننا چاہتا ہوں جس کے لئے تم نے دو مرتبہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا تھا اور پھر میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم اکیلی رہتی ہو مگر تمہارا یہ ٹھاٹ باٹ....."

"میں تمہیں بتا چکی ہوں۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرا شوہر امریکہ میں رہتا ہے جو مجھے خرچ بھیجتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے یہاں ایک چھوٹا سا بزنس بھی شروع کر رکھا ہے۔ میرے کچھ مخلص دوست ہیں جو کاروباری معاملات میں اور ویسے بھی میری مدد کرتے رہتے ہیں۔ اور....."

"کوئی دوست مخلص نہیں ہوتا۔" بشارت نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہر شخص یہاں غرض کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے۔ کسی تحریص کے بغیر کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ میرا باپ بیماری سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا کسی نے اس کے حلق میں دوا کا ایک قطرہ نہیں ٹپکایا۔ میں نے سسک سسک کر زندگی گزاری ہے۔ روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترسا ہوں میں۔ میری بہن کو بھرے بازار میں غنڈے اٹھا کر لے گئے۔ میں چیختا چلاتا رہا کسی نے میری مدد نہیں کی۔ اس لئے کہ میرے پاس کسی کو دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ مجھ سے کسی کی کوئی غرض وابستہ نہیں تھی۔ مجھے جیب تراشی کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا اور جب میں جیل سے باہر نکلا تو زندگی کے راستے میرے لئے پہلے سے زیادہ تاریک اور گنجلک ہو چکے تھے۔ میں روٹی کے ایک ایک نوالے کے لئے ترستا رہا۔ میں نے تین تین دن تک فاقے کئے' کسی نے مجھے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ ہر شخص مجھے لیچھ اور اچھوت سمجھ کر مجھ سے دور بھاگتا رہا۔ کسی نے مجھے سہارا نہیں دیا۔ کوئی میری مدد کے لئے نہیں آیا۔ اس لئے کہ کسی کو مجھ سے کوئی غرض نہیں تھی' لیکن تم اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر یہاں لے آئیں۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی اور تمہارے وہ مخلص دوست جو تمہاری مدد کر رہے ہیں' کون ہیں وہ؟ وہ بلاوجہ تم پر اس قدر مہربان نہیں ہوں گے۔ مجھے کسی نے سہارا کیوں نہیں دیا تھا۔ کوئی مجھ پر اتنا مہربان کیوں

نہیں ہوا تھا؟"

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔" سنینا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اور میں یہ بھی جان گئی ہوں کہ تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آیا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ غرض اور لالچ کے بغیر کوئی کسی پر مہربان نہیں ہوتا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہیں پولیس سے بچا کر یہاں لائی ہوں تو اس میں یقیناً میری غرض پوشیدہ ہے۔ آؤ۔ میں تمہیں اصل کہانی بتاتی ہوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ بشارت نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ سنینا اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ اس نے الماری کا دروازہ کھولا اور اس کے نچلے خانے میں لاکر کھولنے لگی' اور پھر اس نے ایک البم نکال کر بشارت کے سامنے بیڈ پر پھینک دی۔

"پہلے یہ البم دیکھ لو تاکہ میری کہانی سمجھنے میں آسانی رہے۔"

بشارت نے البم اٹھالیا اور بیڈ پر بیٹھ کر ایک ایک لیف پلٹ کر دیکھنے لگا۔ سنینا بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ پہلی تصویر ایک بہت بڑی حویلی کی تھی۔ جس کے گیٹ کے سامنے ایک ادھیڑ عمر مرد' ایک عورت اور دو نو عمر بچے کھڑے تھے۔ ان میں ایک لڑکے کی تصویر تھی جس کی عمر گیارہ برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دوسری لڑکی تھی جو لڑکے سے دو ڈھائی سال بڑی ہوگی۔

"یہ میرے ماں باپ ہیں۔" سنینا نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرا چھوٹا بھائی اور یہ میں ہوں۔"

بشارت لیف پلٹتا رہا اور سنینا اسے تصویروں کے بارے میں بتاتی رہی۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد بشارت اس نتیجے پر پہنچا کہ سنینا کا تعلق ایک خوشحال زمیندار گھرانے سے تھا۔

"اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔"

سنینا نے البم لے کر ایک طرف رکھ دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگی۔

"فیصل آباد سے چند میل دور لب سڑک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے بلکہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ میں اس بستی کی رہنے والی ہوں۔ میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ اب اس بستی کا وجود ختم ہو چکا ہے۔ اس بستی سے ملحق زرعی اراضی میں ڈیڑھ مربع زمین

ہماری ملکیت تھی۔ ان تصویروں سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہم بہت خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ میں' اور میرا چھوٹا بھائی سلطان فیصل آباد کے ایک بہت اچھے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ میرے والد کے پاس ایک پرانی سی فیاٹ کار بھی تھی۔ ہم اس کار پر اسکول آتے جاتے تھے۔ میں اس وقت ساتویں کلاس میں تھی اور میرا بھائی پانچویں کلاس میں۔

"زندگی بہت سکون و اطمینان سے گزر رہی تھی پھر ایک روز یہ خبر آئی کہ حکومت فیصل آباد میں ائرپورٹ بنانے کا منصوبہ بنا رہی ہے اور اس کے لئے جس علاقے کا انتخاب کیا گیا تھا اس میں ہماری اراضی بھی شامل تھی۔ حکومت نے ائرپورٹ کے لئے زمین حاصل کرنے کے لئے علاقے کے زمینداروں سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ میرے والد کو یہ پیشکش کی گئی کہ ہماری زمین کی ویلیو کی آدھی قیمت نقد ادا کی جائے گی اور باقی آدھی قیمت میں کسی دوسری جگہ اتنی ہی زمین دی جائے گی۔ اگر ہم وہ زمین نہ لینا چاہیں تو ہم اپنی زمین کی پوری قیمت بھی وصول کر سکتے ہیں۔

"میرے والد کو لیہ میں تھل کے علاقے میں زمین کی پیشکش کی گئی تھی اور وہ علاقہ ریگستان پر مشتمل ہے۔ وہاں پانی کی بھی قلت ہے۔ وہاں زراعت کے لئے زمین تیار کرنے میں بڑی محنت کی ضرورت تھی۔ اس میں برسوں لگ سکتے تھے۔ میرے والد نے وہاں زمین لینے سے انکار کر دیا اور اپنی زمین کی پوری قیمت وصول کرنے پر اصرار کیا۔ اس طرح تقریباً ایک سال بعد معاملہ طے ہو گیا اور ہم وہ زمین چھوڑ کر شہر منتقل ہو گئے۔

"میرے والد نے محمد آباد میں ایک مکان خرید لیا جو ہماری ضروریات کے لئے کافی تھا۔ وہ علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ کہیں مکان بن چکے تھے اور کہیں زیر تعمیر تھے۔ ہم نے جس جگہ مکان لیا تھا اس کے آس پاس چار چھ گھر بھی آباد ہوئے تھے۔ بہت سے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ کچھ مکان زیر تعمیر تھے۔ وہاں زندگی کی سہولتیں بھی مفقود تھیں۔

"میرے والد نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اراضی کی فروخت سے لاکھوں روپے کی جو رقم ملی تھی اسے بینک میں رکھوانے کے بجائے سونا خرید لیا۔ انہیں شاید بینکوں پر اعتماد نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھی معقول تھی۔ کئی سال پہلے جعلی چیک کے ذریعے ان کے بینک اکاؤنٹ سے بیس ہزار روپے نکلوا لئے گئے تھے اور بینک نے اس کی

ذمہ واری بھی قبول نہیں کی تھی۔ میرے والد نے بینک سے اپنا اکاؤنٹ ختم کر دیا اور اس کے بعد سے کبھی اکاؤنٹ نہیں کھولا۔ اس لئے زمین کی فروخت سے ملنے والی رقم کسی بینک میں رکھوانے کے بجائے انہوں نے سونا خرید لیا۔ ان کا خیال تھا کہ سونے کی قیمت بڑھتی رہے گی تو رقم میں بھی اضافہ ہو گا۔ وہ کسی کاروبار کے لئے بھی سوچ رہے تھے لیکن ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔" سنیتا بات کرتے کرتے رک گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

بشارت اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور ڈائننگ ٹیبل پر سے پانی کا بھرا ہوا گلاس اٹھا کر لے آیا۔ اس نے کچھ کہے بغیر گلاس سنیتا کی طرف بڑھا دیا۔ سنیتا نے آدھا پانی پیا اور گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "ہمیں غلام محمد والے مکان میں آئے ہوئے تین مہینے ہو چکے تھے اور پھر اس رات ایسا طوفان آیا جس نے سب کچھ تباہ کر دیا۔

"وہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں گہری نیند سو رہی تھی کہ شور کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف مجھے لرزا دینے کے لئے کافی تھا کہ ڈاکوؤں نے ہمارے گھر پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور میرا باپ اکیلا جو ڈبل بیرل بندوق سے ان کا مقابلہ کر رہا تھا مگر ڈاکو مکان کے اندر گھس آئے تھے۔ دو ڈاکو چھت پر چڑھ گئے اور کچھ نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔

"ہم ایک کمرے میں تھے۔ ابا نے میری اماں کو کہا کہ وہ مجھے اور سلطان کو لے کر پچھلی کھڑکی سے نکل جائیں۔ اماں' ابا کو اکیلے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں لیکن انہیں ابا کی بات ماننی پڑی اور جب ہم کھڑکی سے کود رہے تھے تو اس وقت وہ کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابا چارپائی دیوار سے لگا کر اس پر کھڑے ہو کر روشندان سے ڈاکوؤں پر فائرنگ کر رہے تھے لیکن وہ دو ڈاکو کسی طرح آگے آنے میں کامیاب ہو گئے جو دروازہ توڑ رہے تھے۔

"ہم کھڑکی سے کود کر پچھلی گلی میں آ گئے۔ اسی وقت شاید ڈاکوؤں نے کمرے کا دروازہ توڑ کر ابا پر حملہ کر دیا تھا۔ ابا کی چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اماں نے مجھے اور سلطان کو ایک طرف دوڑا دیا کہ ہم کسی کے گھر میں چھپ کر اپنی جان بچالیں۔ و

خود دوبارہ کھڑکی کی طرف دوڑی تھیں لیکن وہ ابھی کھڑکی سے دور ہی تھیں کہ کسی ڈاکو کی چلائی ہوئی گولی لگی اور وہ چیخ کر زمین پر گر پڑیں۔ سلطان اماں کی طرف لپکا۔ اسے بھی گولی لگی اور وہ بھی چیختا ہوا گر پڑا۔ میں بھی شاید اماں اور سلطان کی طرف دوڑ پڑتی لیکن اسی لمحے اماں کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وہ مجھے وہاں سے دور جانے کو کہہ رہی تھیں۔ یہ آواز میں نے آخری مرتبہ سنی تھی۔ میں مڑ کر ایک طرف کو بھاگ نکلی۔ کسی ڈاکو نے مجھ پر بھی گولی چلائی تھی لیکن میں بچ گئی اور تاریکی میں دوڑتی ہوئی ایک گلی میں مڑ گئی۔

"میں ہوش میں آئی تو اسپتال میں پڑی تھی۔ پڑوس کے مکانوں میں رہنے والی دو تین عورتیں میرے پاس کھڑی تھیں۔ میرے ہوش میں آنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ایک عورت نے بتایا کہ میرا باپ اور بھائی سلطان مر چکے ہیں۔ اماں کے سینے میں گولی لگی ہے۔ وہ اگرچہ زندہ ہیں لیکن بیہوش پڑی ہیں۔ گولی ان کے دل کے قریب ایسی جگہ پیوست ہے جسے نکالنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ فوری طور پر آپریشن کیا جائے یا نہیں۔"

سنیتا خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر بے پناہ اداسی تھی۔ پرانی یادوں نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس وقت میری عمر تیرہ سال تھی۔ دو تین مہینے زیادہ ہو گی۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میرا کیا حال ہوا ہو گا۔ باپ اور بھائی مر چکے تھے۔ ماں کی ان سے کبھی نہیں بنی تھی۔ ویسے فیصل آباد میں ہمارا دور کا بھی کوئی رشتے دار موجود نہیں تھا۔ میں غیروں کے رحم و کرم پر تھی۔

"تین دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اماں نے بھی دم توڑ دیا۔ امید کی جو ہلکی سی کرن تھی وہ بھی تاریکی میں ڈوب گئی۔ میں اس دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ چوہدری عمرداز کی بیوی مجھے اپنے گھر لے آئی۔ چوہدری عمرداز کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان تھی اور اس کی اس علاقے میں کریانے کی دکان تھی۔ اس کی بیوی عنایت بی بی پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ ان کی شادی کو بیس بائیس سال ہو گئے تھے لیکن اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ عنایت بی بی اکثر ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ وہ

مجھے اور سلطان کو بہت چاہتی تھی۔ بے اولاد تھی نا۔ محلے میں دوسرے بچوں کو بھی بہت پیار کرتی تھی۔

"کئی روز بعد میں اپنے گھر گئی۔ تباہی و بربادی کا وہ منظر آج بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس کمرے میں اب بھی خون کے دھبے موجود تھے۔ وہ میرے باپ کا خون تھا۔ پورے گھر میں ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ ابا کے کمرے میں ان کا پلنگ بھی الٹا ہوا تھا اور اس کے نیچے ایک جگہ فرش کھدا ہوا تھا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے زمین فروخت کرنے کے بعد ابا نے اس رقم سے سونا خرید لیا تھا اور پھر ایک روز ابا لوہے کا ایک صندوقچہ بنوا کر لائے تھے۔ بہت مضبوط صندوقچہ تھا۔ ہضمی قفل کے علاوہ دو اضافی تالے بھی تھے۔ اور پھر اس رات میں نے ابا کو لوہے کا وہ صندوقچہ یہاں گڑھے میں دفن کرتے ہوئے دیکھا۔ اماں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ صندوقچہ دفن کر کے ابا نے فرش پر سیمنٹ کر کے اوپر پلنگ بچھا دیا اور پھر دوسرے روز اس پر قالین بچھ چکا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ ابا نے زمین کی فروخت سے ملنے والی رقم سے سونا خریدا تھا اور پھر لوہے کے اس صندوقچے کو رازداری سے دفن کرتے دیکھا تو مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سونا وہاں دفن کر دیا گیا ہے اور اتفاق سے میں نے وہ جگہ دیکھ لی تھی لیکن اس راز کو میں نے راز ہی رکھا۔ سلطان کو بھی نہیں بتایا کہ سونا کہاں دفن کیا گیا ہے۔

"اور اس افسوسناک واردات کے بعد گھر میں جاکر میں نے اس کمرے میں گڑھا کھدا ہوا دیکھا تو مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکو سونے سے بھرا ہوا وہ صندوقچہ نکال کر لے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کسی کو پتہ چل گیا ہو گا کہ ابا نے بڑی رقم کا سونا خریدا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنے ساتھیوں سے مل کر لوٹنے کا پروگرام بنایا اور ہمارے گھر پر ہلہ بول دیا مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ابا پر تشدد کر کے یہ معلوم کر لیا ہو گا کہ سونا کہاں چھپایا گیا ہے اور اس طرح وہ فرش کھود کر سونے سے بھرا ہوا صندوقچہ نکال کر لے گئے۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا گلاس اٹھایا' پانی کے دو تین گھونٹ پیئے اور بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "اس واقعے کے پندرہ دن بعد

سرگودھا سے ابا کا چچا زاد بھائی آگیا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر دہاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے غیروں کے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنا سامان سمیٹ کر تیاری کر لوں۔ وہ کل مجھے سرگودھا لے جائے گا۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ اپنوں میں سے کوئی تو آگے آیا جو مجھے سہارا دے گا۔

"میرا وہ چچا رات کو چوہدری عمرو راز کے گھر پر ہی رہا تھا۔ سونے کے بارے میں' میں نے پولیس کو بھی بتا دیا تھا اور اس رات چوہدری عمرو راز نے میرے اس چاچا کو بھی سب کچھ بتا دیا کہ ڈاکو میرے ماں باپ اور بھائی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔

"صبح ناشتہ کرنے کے بعد میرا وہ چچا "ابھی آیا" کہہ کر گھر سے نکلا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ میں اپنا سامان باندھے اس کا انتظار کرتی رہی لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔ وہ شاید اس امید پر آیا تھا کہ باپ کی ساری دولت مجھے ملے گی اور وہ مجھ سے ہمدردی جتلا کر اس دولت پر قبضہ کر لے گا لیکن اسے پتہ چل گیا تھا کہ مجھے وراثت میں دکھوں اور غموں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

"ہمارا مکان خالی پڑا تھا۔ میں چوہدری عمرو راز کے گھر پر ہی رہ رہی تھی۔ چاچی عنایت بی بی مجھے بہت چاہتی تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی لیکن کچھ عرصے بعد ہی میں نے محسوس کیا کہ چاچا عمرو راز کی نظروں میں فرق آگیا تھا۔ بعض اوقات وہ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھتا کہ مجھے شرم آجاتی۔

"ایک سال گزر گیا۔ میں لڑکپن سے نکل کر دوشیزگی کی عمر میں قدم رکھ چکی تھی اور پھر ایک روز چاچی عنایت بی بی بیمار پڑ گئی۔ اسے ہیضہ ہو گیا تھا۔ اس کا علاج بھی ہوا اور میں نے بھی اس کی بڑی خدمت کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی اور آٹھویں دن اس کا انتقال ہو گیا۔

"اس کے دو مہینے بعد چاچا عمرو راز مجھے لے کر جھنگ آگیا۔ جھنگ شہر سے تقریباً پانچ میل دور چند گھروں پر مشتمل وہ چھوٹی سی بستی ہماری منزل ثابت ہوئی۔ بستی کے سرے پر واقع اس گھر میں ایک بوڑھی عورت اور اس کا شوہر رہائش پذیر تھے۔ وہ کاشتکار تھے۔

"چوہدری عمرو راز مجھے یہ کہہ کر لایا تھا کہ ہم چند روز بعد واپس آجائیں گے لیکن

یہاں آنے کے دوسرے دن یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ اس کا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی دکان اور مکان فروخت کر آیا تھا۔

"اس روز گھر پر کوئی نہیں تھا۔ بڑھیا اور اس کا شوہر کھیتوں پر گئے ہوئے تھے۔ چوہدری عمردراز بھی گھر پر نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے' جب بڑھیا گھر پر موجود تھی' وہ یہ کہہ کر گیا تھا کہ جھنگ شہر جا رہا ہے' دوپہر تک لوٹ آئے گا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد بڑھیا بھی کھیتوں پر چلی گئی۔

"میں آنگن میں کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔ میں صرف تین چار جوڑے ساتھ لے کر آئی تھی اور وہ سب میلے ہو چکے تھے۔ میں نے مقامی عورتوں کی طرح دھوتی باندھ لی اور بڑھیا کا ایک پرانا کرتا پہن لیا۔ میرا خیال تھا کہ تیز دھوپ میں آدھے پونے گھنٹے میں میرے کپڑے سوکھ جائیں گے تو میں پہن لوں گی۔

"میں ابھی کپڑے دھو ہی رہی تھی کہ باہر کا دروازہ کھلا اور چوہدری عمردراز کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے اندر سے دروازے کی زنجیر لگا دی تھی۔ پتہ نہیں اس نے کس طرح زنجیر کھول لی تھی۔

"میں بدحواس ہو کر کمرے کی طرف دوڑی لیکن اس سے پہلے کہ اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرتی' چوہدری عمردراز دروازے کو دھکا دے کر اندر گھس آیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"میں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ چوہدری عمردراز نے دروازہ روک رکھا تھا۔ و ذرا آگے بڑھا تو میں نے جھکائی دے کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے پکڑ کر چارپائی پر پھینک دیا۔ میں چیختی چلاتی رہی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے' منت سماجت کی' خدا اور رسول کے واسطے دیئے مگر جب آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھی ہو تو نہ خدا یاد رہتا ہے نہ رسول اور نہ قرآن۔

"چوہدری عمردراز مجھے بیٹی کہہ کر پکارا کرتا تھا اور اس روز اس نے اپنی بیٹی کی عزت کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ میری چیخیں کمرے میں گونجتی رہیں۔ میں بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی تھی۔

"اس رات چوہدری عمردراز نے ایک بار پھر میرے ساتھ وہی شیطانی کھیل کھیلنے

کوشش کی۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔ میں نے چارپائی پر لیٹنے سے پہلے درانتی اپنے تکئے کے نیچے چھپا کر رکھ لی تھی۔ چوہدری عمردراز نے جیسے ہی مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی میں نے اس پر درانتی سے حملہ کر کے اس کا نرخرہ ادھیڑ دیا۔ اور پھر میں وہاں سے بھاگ نکلی اور آج تک بھاگ رہی ہوں۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور اس میں بچا ہوا پانی ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لیا۔

"اور وہ تمہارا شوہر..... جو امریکہ میں ہے۔" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اس کی کہانی پر افسوس ہو رہا تھا۔

"وہ ایک الگ کہانی ہے۔" سنیتا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں پتہ نہیں کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی ہوئی ملتان پہنچ گئی۔ وہاں ایک نیک دل خاتون مل گئی۔ اس نے مجھے سہارا دیا اور بیٹی بنا کر رکھا۔ میں تقریباً تین سال ملتان میں رہی۔ وہاں دو اور جوان لڑکیاں تھیں جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ اس خاتون کی بیٹیاں ہیں۔ تین سال کے اس عرصے میں اس خاتون نے مجھے سلائی' کڑھائی سمیت ایسے اور بھی کئی کام سکھا دیئے اور پھر ایک دن وہ ہمیں لے کر لاہور آگئی۔ یہاں ہم سمن آباد کے قریب پکی ٹھٹھی کے ایک مکان میں رہے۔

"اس مکان میں چند روز تو سکون سے گزرے پھر وہاں مختلف لوگوں کی آمدورفت شروع ہو گئی۔ بڑے بڑے لوگ آتے تھے وہاں۔ چم چماتی ہوئی قیمتی گاڑیوں پر۔ ان سے ہماری بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ بلکہ ان ملاقاتوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

"ایک روز اس خاتون کی ایک بیٹی غائب ہو گئی۔ ایک ہفتے بعد دوسری بیٹی بھی کہیں چلی گئی۔ اس کے چند روز بعد وہ خاتون مجھے گلبرگ کی ایک عالیشان کوٹھی میں لے گئی۔ وہاں دو آدمیوں کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم عورت بھی موجود تھی۔ وہ عورت مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ میرے بارے میں' میرے ماں باپ کے بارے میں پوچھتی رہی۔ اس کا لہجہ بہت ہمدردانہ تھا۔ میں سب کچھ اسے بتاتی چلی گئی۔

"بہت دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ نیک دل خاتون' جسے میں اماں کہا کرتی تھی' وہاں موجود نہیں ہے۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی اور جب میں وہاں سے جانے کے لئے اٹھی تو اس بھاری بھرکم عورت نے مجھے روک لیا اور یہ سنسنی

خیز انکشاف کیا کہ وہ ہمدرد اور نیک دل خاتون' جسے میں اماں کہتی تھی' میری قیمت وصول کر کے جا چکی ہے۔ ڈھائی لاکھ روپے۔ اس نے مجھے ڈھائی لاکھ روپے میں بیچ دیا تھا۔

"میں گلبرگ کی اس عالیشان کوٹھی میں قیدی بن کر رہ گئی۔ کوٹھی میں تو میں آزادی سے گھوم سکتی تھی لیکن مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شام کے بعد وہ کوٹھی راجہ اندر کا دربار بن جاتی۔ پتہ نہیں کہاں سے اتنی لڑکیاں آجاتی تھیں۔ جوان اور حسین۔ کوٹھی میں بڑے بڑے لوگوں کی آمدورفت تھی۔ ان میں اعلیٰ سرکاری آفیسر بھی تھے' تاجر اور صنعت کار بھی اور انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی۔ یہ سب وہ معززین تھے جنہیں معاشرے کے ستون کہا جاتا ہے۔ وہ رات کے اندھیرے میں عیاشی کے لئے اس کوٹھی میں آتے تھے۔ شہر میں اور نہ جانے کتنی ایسی کوٹھیاں تھیں۔

"مجھے پہلی مرتبہ جس شخص کے حوالے کیا گیا وہ ایک فلمی ہدایت کار تھا جو رات بھر شراب پی کر مجھے فلمی ہیروئن بنانے کی باتیں کرتا رہا۔ میں آدھی رات کو اسے غافل پاکر بھاگ نکلی لیکن میں کہاں جاتی۔ میرا ٹھکانا کہاں تھا۔ مجھ جیسی لڑکیوں کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے۔ میں ایک پارک میں گھس کر بینچ پر لیٹ گئی۔ میرا خیال تھا کہ رات اس پارک میں گزار کر صبح کوئی ٹھکانہ تلاش کروں گی لیکن مجھے بینچ پر لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ دو پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ پولیس والے بھی بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس وقت کہاں شکار مل سکتا ہے۔ اندھیری راتوں میں بعض پارکوں کے کونوں کھدرے بھی تھوڑی دیر کے لئے آباد ہو جاتے ہیں اور پولیس والوں کو ان کونوں کھدروں میں ایسے ہی جوڑوں کی تلاش ہوتی ہے جو تھوڑی دیر کے لئے وہاں آتے ہیں۔ لیکن اس رات میں پولیس کے قابو آگئی۔

"وہ پولیس والے میرے ساتھی کے بارے میں مجھ سے پوچھتے رہے۔ پھر تھانے لے آئے۔ تھانے دار آدھے گھنٹے تک مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ پھر مجھے دو سنتریوں کی نگرانی میں اپنے کوارٹر میں بھیج دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ قانون کا محافظ ہے۔ اب میری سختیوں کے دن ختم ہو جائیں گے۔ مزید آدھے گھنٹے بعد تھانیدار بھی کوارٹر میں آگیا اور ایک بار پھر مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے بھاگی تھی۔ میں نے اسے گلبرگ کی کوٹھی میں لڑکیوں کا دھندا کرنے والی

بھاری بھرکم شبنم نامی اس عورت کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"اور پھر تھانیدار کو اپنی توند پر پٹی ڈھیلی کرتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ قانون کا وہ محافظ بھی لٹیرا نکلا۔" وہ سنتریوں کو میرے بارے میں ہدایات دے کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا اور پھر صبح سویرے وہ موٹی شبنم وہاں آکر مجھے دوبارہ اپنی کوٹھی میں لے گئی۔

"میں ایک ایسے گرداب پھنس گئی تھی جس سے نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ میں نے کوشش جاری رکھی۔ مگر یہ گرداب دراصل ایک ایسا طاغوتی چکر ثابت ہوا جہاں قدم قدم پر شکاری گھات لگائے بیٹھے تھے۔ کوئی لڑکی بچ کر جا ہی نہیں سکتی اور پھر میں تو بے سہارا تھی۔

"ایک روز مجھے انور نامی ایک شخص کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ منشیات کا سوداگر تھا۔ ہیروئن سپلائی کرتا تھا۔ اس نے مجھے لالچ دیا کہ اگر میں اس بزنس میں اس کے ساتھ شامل ہو جاؤں تو وہ مجھے شبنم سے خرید لے گا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد میری ملاقات رفیق سے ہوئی۔ اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا اور مجھے شبنم سے خرید لیا۔

"میں ایک گھر چاہتی تھی۔ یا کم از کم ایسی جگہ جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں۔ جہاں بلا خوف و خطر سکون کی زندگی گزار سکوں۔ رفیق نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھ سے شادی بھی کر لی۔ سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔ رفیق سے نکاح ہو جانے کے باوجود مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ جب اس کا دل بھر جائے گا تو چار حروف پر مشتمل کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دے گا اور مجھے کسی اور کے حوالے کر دے گا لیکن میں بہت ٹھوکریں کھا چکی تھی۔ اب اپنے آپ کو کچھ مضبوط کر لینا چاہتی تھی۔ شادی کے چند ہی روز بعد میں نے رفیق کو مجبور کیا تو اس نے یہ مکان میرے نام ٹرانسفر کرا دیا۔

"رفیق اکثر امریکہ' برطانیہ اور کینیڈا کے کاروباری دورے کیا کرتا تھا۔ آخری مرتبہ وہ تین سال پہلے گیا تھا۔ اس کے بعد لوٹ کر نہیں آیا۔ مجھے اس نے خط لکھ دیا تھا کہ اس نے وہاں شادی کر لی ہے اور وہ کچھ عرصے تک واپس نہیں آئے گا۔ اس کی شادی والی خبر درست تھی لیکن کچھ عرصے بعد انکشاف ہوا کہ وہ ہیروئن کا اسمگلر ہے۔ ہر پھیرے میں

کسی نہ کسی طرح کلو ڈیڑھ کلو ہیروئن لے جاتا ہے۔ امریکہ کی اینٹی نارکوٹکس فورس کو اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ اس کے سامان کی اچھی طرح تلاشی بھی لی جاتی تھی۔ اس کی نگرانی بھی کی جاتی تھی لیکن اس کی خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

"اینٹی نارکوٹکس فورس نے اسے پھانسنے کے لئے جال پھیلایا اور وہ بڑی آسانی سے اس جال میں پھنس گیا۔ اس جیسے عیاش لوگ بڑی آسانی سے ایسی چالوں میں آجاتے ہیں۔ وہ لڑکی اینٹی نارکوٹکس فورس کی ایجنٹ تھی جس نے اس سے شادی کر لی تھی۔ شادی کے چند روز بعد ہی رفیق اس کے سامنے کھل گیا اور اسے بتا دیا کہ اس کا ہیروئن اسمگل کرنے کا طریقہ کار کیا ہے اور آخری پھیرے میں لائی ہوئی ہیروئن اس نے کہاں چھپا رکھی ہے۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے آٹھ سال کی سزا ہو گئی جس میں سے تین سال بھگت چکا ہے۔"

اس نے خاموش ہو کر گلاس اٹھالیا جو خالی ہو چکا تھا۔ بشارت اٹھ کر گلاس میں پانی لے آیا۔ "اور تمہارے وہ دوست؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ وہ لوگ ہیں جن سے شبنم کی کوٹھی میں ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ کوئی دوست مخلص نہیں ہوتا۔ یہ حرص وہوس کے رشتے ہیں۔ کسی لالچ اور مقصد کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں شادی کر چکی ہوں اور گھر والی بن کر رہنا چاہتی ہوں' یہ لوگ مجھ سے اب بھی توقعات وابستہ رکھے ہوئے ہیں اور مجھے قیمتی تحائف دیتے رہتے ہیں' جنہیں قبول کر لینے میں' میں کوئی حرج نہیں سمجھتی اور مجھے حیرت ہے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے مجھے امریکہ سے بھی کچھ رقم آجاتی ہے۔ رفیق جیل میں ہے اور میں نہیں جانتی اس کے نام سے یہ رقم کون بھیجتا ہے؟"

"اور وہ کاروبار' جس کا تم نے ذکر کیا تھا؟" بشارت نے پوچھا۔

"میں ہانگ کانگ اور سنگاپور سے کچھ چیزیں منگوا کر یہاں بعض بڑے دکانداروں کو سپلائی کرتی ہوں۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "کراچی اور لاہور میں بڑی تعداد میں کھیپی موجود ہیں جو پہلے صرف ہانگ کانگ اور سنگاپور جایا کرتے تھے لیکن اب تو سینٹرل ایشیا کی نو آزاد ریاستوں تک جانے لگے ہیں۔ المناۃ آج کل ان کھیپیوں کا سب سے بڑا مرکز بنا ہوا ہے۔

میں نے بھی چار پانچ آدمی رکھے ہوئے ہیں جنہیں اپنے خرچ پر بھیجتی ہوں۔ وہ میرے لئے مال لے کر آتے ہیں اور میں انہیں کمیشن بھی دیتی ہوں اور مجھے بھی اس مال پر اچھا خاصا منافع مل جاتا ہے۔"

"ہوں۔" بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں شبہ نہیں کہ کام محنت کا ہے اور تم اپنے ماضی کو بھلا کر ایک اچھی اور صاف ستھری زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہو لیکن میں ایک بار پھر اپنا وہی سوال دہراؤں گا کہ تم نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے پولیس سے کیوں بچایا؟"

"میں تو ماضی کو بھلا کر اچھی اور صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتی ہوں لیکن کچھ لوگ ایسا نہیں چاہتے۔ وہ مجھے دوبارہ گندگی کی اس دلدل میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے مجھے کسی ایسے آدمی کی تلاش تھی جو مخلص بھی ہو اور نڈر بھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔ "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ تمہیں پناہ دینے میں میری بھی غرض پوشیدہ تھی۔ میں نے تمہیں ایکشن میں دیکھا تھا۔ تم نے کس طرح اپنے ساتھی کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی اور کس طرح وہاں سے نکل گئے تھے۔ تمہاری یہ کارروائی دیکھ کر ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ میرے مطلوبہ آدمی تم ہو۔ اس لئے میں تمہیں وہاں سے نکال لائی تھی اور پھر نسبت روڈ والے اڈے تک بھی میں نے اسی خیال سے تمہارا پیچھا کیا تھا کہ تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔"

"تم نے مجھے ایک جرم کرتے دیکھا تھا اور اسی لئے مجھے پناہ دی تھی کہ مجھے بلیک میل کر کے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرو گی۔" بشارت نے کہا۔

"پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہیں دباؤ میں رکھوں گی۔" سنیتا پہلی مرتبہ مسکرائی۔ "لیکن اب میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کروں گی۔ میں تمہیں زبردستی یہاں اس لئے لائی تھی کہ یہ جگہ تمہارے لئے سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ کم از کم آج کی رات تمہیں ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں محفوظ رہو۔ رات گزارنے کے بعد تم جب اور جہاں جانا چاہو جاسکتے ہو۔ میں تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

"وہ کون لوگ ہیں جو تمہیں دوبارہ اس گندگی میں گھسیٹنا چاہتے ہیں؟" بشارت نے

سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شبنم اور انور۔" سنینا نے جواب دیا۔ "انور ہیروئن کا سپلائر ہے اور شبنم لڑکیوں کی سپلائر۔ انور کی طرف سے زیادہ دباؤ نہیں لیکن شبنم کئی مرتبہ مجھے دھمکیاں بھی دے چکی ہے۔ اس نے خونخوار قسم کے غنڈے پال رکھے ہیں۔ اس کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات بھی ہیں۔ مجھے زیادہ خوف اس کی طرف سے ہے لیکن بہرحال' یہ میرا درد سر ہے۔ میں کسی اور کو اس معاملے میں کیوں گھسیٹوں!"

بشارت خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ اسے اس کی داستان سن کر بڑا دکھ ہوا تھا۔ سنینا نے بڑی سچائی سے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ بشارت کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہوا تھا۔ وہ شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن اسے قدم قدم پر بھٹکایا گیا تھا۔ ہر گام پر ٹھوکریں ماری گئی تھیں۔ اس نے جرم و گناہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بھوک جیسی اذیت برداشت کی تھی۔ تین تین دن تک فاقے کئے تھے لیکن پیٹ میں لگنے والی آگ آخر کار اسے استاد گنگو کے اڈے پر لے گئی تھی اور وہ اس دلدل میں دھنستا چلا گیا تھا۔ سنینا ایک مرتبہ اس گندگی سے نکل آئی تھی اور اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے مجبور کیا جارہا تھا کہ وہ دوبارہ ذلت و رسوائی کے اس راستے پر آجائے۔

"نہیں نہیں' اب ایسا نہیں ہو گا۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا مجھ سے کچھ کہا؟" سنینا نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اب یہیں رہوں گا۔ تمہارے ساتھ۔" بشارت نے جواب دیا۔

"کیا واقعی؟" سنینا کا چہرہ کھل اٹھا۔

"ہاں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ وہ لوگ اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے پائیں گے۔ اس کے لئے خواہ مجھے اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔" بشارت نے جواب دیا۔

"مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آرہا۔" سنینا کے لہجے میں اب بھی بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔" بشارت نے جواب دیا اور پھر سائیڈ ٹیبل پر

رکھے ہوئے ٹائم پیس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے اب بہت باتیں ہو چکیں۔ کوئی ایک آدھ موضوع صبح کے لئے بھی چھوڑ دینا چاہئے۔ ڈھائی بج رہے ہیں۔ مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔ مجھے کوئی جگہ بتا دو جہاں میں سو سکوں۔"

"جگہ!" سنینا کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ "تم نے تو میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔ یہ سارا گھر تمہارا ہے جہاں جی چاہے سو جاؤ۔ ویسے چاہو تو اسی بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔"

"نہیں۔ یہ تمہارا بیڈ ہے۔ میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔" بشارت کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "اور ہاں۔ میرے یہاں رہنے سے کسی کو کوئی شبہ تو نہیں ہو گا۔ میرا مطلب ہے محلے والے کوئی اعتراض تو نہیں کریں گے؟"

"کیوں' محلے والے اعتراض کیوں کریں گے؟" سنینا بھی کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "یہ میرا گھر ہے۔ یہاں کسی کے آنے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ ویسے اس گلی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا بزنس کرتی ہوں۔ میرے پاس مہمان آتے رہتے ہیں۔ ویسے یہ لوگ مجھے اسمگلر کہتے ہیں۔"

"اور اگر کسی نے میرے بارے میں مخبری کردی تو؟" بشارت بولا۔

"کسی میں اتنی ہمت نہیں۔ سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔" سنینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمہیں پہچانتا کون ہے۔ تمہاری کیا مخبری کریں گے۔ پولیس والوں کو کیا بتائیں گے کہ تم کون ہو۔ فی الحال تو تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں کہ برا وقت بتا کر نہیں آتا لیکن جب ایسا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ چلو۔ میں تمہیں کمرہ دکھادوں آرام سے سو جاؤ۔"

وہ بشارت کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر آگئی اور ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر بتی جلادی۔ یہ بھی بیڈ روم ہی تھا۔ بیڈ پر بے شکن چادر بچھی ہوئی تھی۔

"اب تم سو جاؤ۔ صبح باتیں ہوں گی۔" سنینا کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ بشارت کچھ دیر کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور جوتے اتار کر بستر پر گر گیا۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند غائب ہو گئی تھی۔ سنینا کی باتیں اس کے دماغ پر کچوکے سے لگا رہی تھیں۔ کیا غریب اور بے سہارا لوگوں کا کوئی ہمدرد نہیں ہوتا۔ ہر

شخص ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں کرتا ہے۔ خود اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی تھیں۔ کسی بھی موقع پر اسے سنبھلنے نہیں دیا گیا تھا اور سنیتا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ عبرت انگیز تھا۔ اسے تو مرجانا چاہئے تھا لیکن وہ باہمت لڑکی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرتی رہی اور آج وہ زندگی کے اس دوراہے پر کھڑی تھی جہاں ایک طرف ذلت ورسوائی اور گناہوں کی دلدل تھی اور دوسری طرف وہ راستہ تھا جس پر کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ اس نے اس کانٹوں بھرے راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسے کسی ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو اس راستے پر اس کے ساتھ چل سکے اور بشارت نے اس راہِ خارزار پر اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا حالانکہ اس کے پیر چھلنی ہو گئے تھے لیکن سنیتا کی داستان نے اسے ایک نیا حوصلہ بخشا تھا۔

☆=====☆=====☆

بشارت یہ سب کچھ سوچتے ہوئے آخر کار نیند کی آغوش میں پہنچ ہی گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ وہ کچھ دیر بستر پر ہی پڑا اینٹھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ کچن کی طرف سے برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا کچن کی طرف آگیا لیکن پھر دروازے ہی میں رک گیا۔ وہ سنیتا کی نوکرانی بی بی تھی۔

"سنیتا کہاں ہے؟" بشارت نے پوچھا۔

"وہ تو سو رہی ہے۔ تمہارے لئے چائے بناؤں بیٹا؟" بی بی نے پوچھا۔

"ہاں بنا دو۔" بشارت کہتے ہوئے ہال کمرے کی طرف آگیا اور سینٹر ٹیبل پر رکھا ہوا اخبار اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جیسے ہی اخبار کھولا' اچھل پڑا۔ پہلے ہی صفحے پر رنگ محل والے واقعے کی خبر نمایاں سرخی سے شائع ہوئی تھی اور اس کے ساتھ تصویریں بھی تھیں۔

بشارت وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔ رپورٹر کی اطلاع کے مطابق رنگ محل میں سود پر قرضے دینے والے چوہدری عمر ساہو کار کا مینیجر شہاب الدین بینک سے چار لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم نکلوا کر واپس آرہا تھا اس کے ساتھ دو محافظ بھی تھے۔ شہاب الدین اپنے دفتر سے ابھی کچھ دور ہی تھا کہ دو راہزنوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کے ہاتھ سے نوٹوں سے بھرا ہوا چرمی بریف کیس چھین کر بھاگنے کی کوشش کی۔ شہاب الدین کے محافظوں کی مداخلت سے

صورت حال سنگین ہو گئی۔ فائرنگ کے تبادلے میں دونوں محافظ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ ایک راہزن بھی گولیاں لگنے سے شدید زخمی ہوا جسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسے چار گولیاں لگی ہیں۔ اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تک زخمی راہزن کی شناخت نہیں ہو سکی تاہم اس کا دوسرا ساتھی رقم سے بھرا ہوا چرمی بیگ چھین کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

خبر پڑھنے کے بعد بشارت تصویریں دیکھنے لگا۔ دونوں گن مینوں اور شکرے کی تصویر کے علاوہ اس شخص کی تصویر بھی تھی جس سے رقم سے بھرا ہوا بیگ چھینا گیا تھا۔ وہ چوہدری عمر کا مینیجر شہاب الدین تھا۔

بشارت اس اتفاق پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ شہاب الدین سے چھینی جانے والی رقم دراصل چوہدری عمر کی تھی۔ چوہدری عمر' جس نے اس کے باپ کا مکان بیچ دیا تھا اور جیل سے رہا ہونے کے بعد جب بشارت نے اس سے رقم کا مطالبہ کیا تھا تو چوہدری عمر نے اسے دھکے دے کر اپنے دفتر سے نکلوا دیا تھا اور اب اتفاق سے ساڑھے چار لاکھ روپے کی رقم اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔

آخری صفحے پر ایک اور خبر دیکھ کر وہ ایک بار پھر اچھل پڑا۔ یہ خبر نسبت روڈ پر استاد گنگو کے اڈے پر رونما ہونے والے واقعے کے بارے میں تھی اور ذیلی سرخی میں اس کا نام بھی تھا۔

یہ خبر پولیس کے ذرائع سے شائع کی گئی تھی جس کے مطابق بدنام جیب تراش بشارت پولیس کو ایک اور سنگین جرم میں مطلوب تھا۔ گزشتہ رات نسبت روڈ پر استاد گنگو کے اڈے پر بشارت کی موجودگی کی اطلاع پر اس کی گرفتاری کے لئے پولیس نے چھاپہ مارا تو وہ فائرنگ کرتا ہوا فرار ہو گیا۔ فرار ہوتے ہوئے اس نے اڈے پر موجود اپنے ایک ساتھی کو بھی گولی مار کر ہلاک کر دیا جس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ پولیس کو اس نے اطلاع دی تھی۔ پولیس نے پورے علاقے کی ناکہ بند کر لی لیکن بشارت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

یہ خبر پڑھ کر بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے

ہونے لگے۔ جانو چاچا پولیس کی گولی سے ہلاک ہوا تھا اور اس کا قتل بشارت کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سنیتا کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا لیکن پہلا قدم اٹھاتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

سنیتا بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس نے شب خوابی کا باریک لباس پہن رکھا تھا جو ٹانگوں پر سے اوپر تک سمٹا ہوا تھا۔ وہ واپس مڑنا چاہتا تھا کہ سنیتا نے کروٹ بدلی اور ساتھ ہی آنکھیں کھول دیں۔ بشارت کو دیکھ کر وہ اٹھ گئی۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر بڑی قسم کا شب خوابی کا لباس نیچے کھینچ لیا۔

"کیا بات ہے' اتنا بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟" سنیتا نے بکھرے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہو؟"

"یہ..... یہ خبر پڑھو اسے۔" بشارت نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ صفحہ اوپر تھا جس پر اس کے حوالے سے خبر چھپی تھی۔

وہ خبر پڑھ کر سنیتا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"میں نے تم سے کیا کہا تھا۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "قانون کے محافظ کسی کو قتل بھی کر دیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ وہ تو قانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لئے گولی چلاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کوئی بے گناہ بھی مارا جائے تو اس کا الزام کسی اور بے گناہ کے سر تھوپ دینا ان کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ یہی بات میں نے کل رات بھی کہی تھی اور اس خبر سے ثابت بھی ہو گیا ہے کہ میں نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔"

"اور..... اور یہ دوسری خبر بھی پڑھو۔" بشارت نے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا اخبار پلٹ دیا۔

سنیتا اخبار دیکھ رہی تھی اور بشارت سنیتا کو۔ اس کا لباس بہت باریک تھا جس سے اس کا جسم جھلک رہا تھا۔ بشارت نے کسی عورت کو ایسے لباس میں اتنے قریب سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور تنفس بے ربط ہونے لگا۔ سنیتا نے خبر پڑھنے کے بعد اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"تمہارا وہ ساتھی ابھی زندہ ہے اور....."

"ہم بعد میں بات کریں گے۔" بشارت کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ "تم تیار ہو کر باہر آ جاؤ۔ میں ہال میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

سنیتا کو اس کے اس طرح اچانک اٹھ جانے پر بڑی حیرت ہوئی۔ بشارت نے باہر جاتے ہوئے بھی مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر ساری بات سنیتا کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے نظریں جھکا کر اپنے آپ کو دیکھا اور اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ لباس تبدیل کر کے ہال میں آئی تو بشارت صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سنیتا سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اندر سے اخبار اٹھا لائی تھی۔ بی بی نے اس کے سامنے بھی گرم گرم چائے کا کپ رکھ دیا اور کچن میں چلی گئی۔

"تم نے دونوں خبریں....."

"چائے پیو۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہم کمرے میں چل کر بات کریں گے۔" اس نے گردن گھما کر کچن کی طرف بھی دیکھا تھا۔

"کیا یہ عورت قابل اعتماد نہیں؟" بشارت نے مدھم لہجے میں کہتے ہوئے کن انکھیوں سے کچن کی طرف دیکھا۔

"قابل اعتماد ہے لیکن تمہارے بارے میں ابھی وہ کچھ نہیں جانتی۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "لیکن بہرحال' ہمیں احتیاط کا دامن تو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔"

وہ دونوں اٹھ کر سنیتا والے کمرے میں آ گئے۔ سنیتا خود تو بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور بشارت سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو تمہیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارے ہاں کی پولیس کس طرح کام کرتی ہے۔" سنیتا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"اس کا تجربہ تو مجھے اس دن ہو گیا تھا جب غنڈے بھرے بازار میں میری بہن کو اٹھا کر لے جا رہے تھے اور پولیس نے مجھے جیب تراشی کے الزام میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں نے تو جیل میں رہتے ہوئے بھی بڑی شرافت کا ثبوت دیا تھا لیکن قدم قدم پر مجھے گندگی میں گھسیٹنے کی کوشش کی جاتی رہی اور جیل سے

باہر نکلنے کے بعد بھی پولیس ہی مجھے گھیرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے جرائم کی راہ پر دھکیلنے میں پولیس کا بھی بہت ہاتھ ہے لیکن بہرحال' کل کے واقعہ سے پہلے میں جیب تراش تھا۔ جیب تراش۔ کبھی کبھار پولیس مجھے کسی اور چھوٹی موٹی واردات میں پھانسنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کا مقصد کچھ نذرانہ وصول کرنا ہوتا تھا۔ مٹھی گرم ہو جانے کے بعد وہ وقتی طور پر مجھے بھول جاتے تھے لیکن یہ ..... یہ مجھ پر قتل کا الزام..... یہ سراسر جھوٹ ہے۔ ظلم ہے....."

"پولیس والے کسی بھی جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" سنیتا نے کہا۔ "اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ جاؤ تو وہ تم سے نہ صرف جانو چاچا کے قتل بلکہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم کا اعتراف کروالیں گے اور عدالت میں تمہارے خلاف چار چھ جھوٹے گواہ بھی پیش کر دیئے جائیں گے۔"

"لیکن میں نے ایسا کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔" بشارت نے کہا۔

"نہیں کیا ہو گا۔" سنیتا بولی۔ "رنگ محل میں جو کچھ ہوا تھا وہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہاں تین قتل ہوئے تھے۔ تمہارا دوست ایک محافظ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور دونوں محافظ تمہارے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے تھے۔ وہ شاید سنگین جرم نہیں تھا۔"

"وہ..... وہ تو میں نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے مار دیتے۔" بشارت نے کہا۔

"بہت بھولے ہو۔" سنیتا مسکرا دی۔ "تمہارے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا ہے اور یہ بات ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی کہ یہاں اپنا دفاع کرنا بھی سنگین جرم ہے۔ کل رنگ محل والے واقعے میں دو آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے تھے اور قتل آخر قتل ہی ہوتا ہے۔ اور پھر دہرا قتل۔ جس کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی اور اب تو تیسرا قتل بھی تمہارے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ بارہ گھنٹوں کے اندر اندر تین قتل۔ ایسے آدمی کو تو کسی صورت بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "رنگ محل والے واقعے میں تم ابھی تک پولیس کے لئے نامعلوم ہو لیکن وہ بہت جلد پتا چلا لیں گے کہ تم وہی بشارت ہو جو رات کو نسبت روڈ پر پولیس

کے چھاپے کے دوران میں اپنے ایک ساتھی کو گولی مار کر فرار ہو گئے تھے۔"

"لیکن جانو چاچا کو میں نے گولی نہیں ماری تھی۔" بشارت جلدی سے بولا۔

"میں کب کہتی ہوں کہ جانو چاچا کو تم نے ہی قتل کیا تھا مگر پولیس نے وہ جرم تمہارے کھاتے میں تو ڈال دیا ہے نا۔" سنیتا نے کہا۔

"میرا تو دماغ گھوم رہا ہے۔ سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے۔" بشارت نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے تمہیں ایسی باتوں کو سمجھ لینا چاہئے۔" سنیتا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے اور ایسے کھیل جلدی ختم نہیں ہوا کرتے۔ بڑی لمبی بازیاں چلتی ہیں اور جیت اس کی ہوتی ہے جو کھیل کو سمجھتا ہو۔ چال چلنا جانتا ہو۔ تمہیں اس کھیل کو سمجھنا ہو گا۔ چالیں سیکھنی ہوں گی۔ اگر تم ذہانت کا مظاہرہ نہیں کرو گے تو پہلی ہی بازی میں مات کھا جاؤ گے اور پھر یا تو تم زندگی بھر جیل میں سڑتے رہو گے یا تمہاری زندگی کے سفر کا اختتام پھانسی کے تختے پر ہو گا۔"

"میں..... میں پاگل ہو جاؤں گا۔" بشارت نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ "میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ صورت حال اس قدر سنگین ہو جائے گی۔"

اور ویسے یہ حقیقت تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ دور رہا تھا۔ بچپن میں بھی ہمیشہ گلی کے لڑکوں سے پٹ کر آتا تھا۔ اس نے کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا تھا تو وہاں بھی لڑکوں سے پٹتا رہتا تھا۔ جیل میں بھی وہ قیدی لڑکوں کی سرگرمیوں سے دور ہی رہتا تھا اس نے کبھی چیونٹی تک نہیں ماری تھی اور کل رنگ محل میں اپنے دوست شکرے کو بچانے گیا تھا تو اس کے ہاتھوں دو آدمی مارے گئے تھے' لیکن اب سے ایک گھنٹہ پہلے تک اسے بالکل ادراک نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کیا کر چکا ہے۔ اخبار کی خبروں اور سنیتا کی باتوں نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جانو چاچا کو نہیں مارا تھا لیکن پولیس نے یہ تیسرا قتل بھی اس کے کھاتے میں ڈال دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دے یا اپنے آپ کو بچانے کے لئے زندگی بھر بھاگتا رہے۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس میں اب حوصلہ نہیں رہا تھا۔ ہار مان لی

تھی۔ گرفتاری دینے کی صورت میں پولیس اس کا جو حشر کرتی اس کا تصور کر کے وہ کانپ اٹھا۔ پولیس نہ جانے اس سے مزید ایسے کتنے جرائم کا اعتراف کرالے گی جن کے بارے میں وہ کچھ جانتا بھی نہیں ہو گا۔ وہ عدالت میں بھی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کر سکے گا۔

اس نے کسی اخبار یا رسالے میں پڑھا تھا کہ جب انسان دولت کھودے تو کچھ نہیں کھوتا۔ اگر حوصلہ کھودے تو بہت کچھ کھو جاتا ہے۔ آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کھو جاتا ہے لیکن روح مرجائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔

یہ الفاظ بشارت کے ذہن میں گونج سی پیدا کرنے لگے۔ اس کی آبرو اس کی بہن تھی جسے غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی روح کو اب تک کچلا جاتا رہا تھا۔ روح زخموں سے چُور چُور تھی لیکن مری نہیں تھی۔ اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی اس نے اپنے آپ کو اپنے پیروں پر کھڑا رکھا تھا اور اب حوصلہ ہار جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ سب کچھ ہار جائے گا۔ اپنی زندگی بھی ہار جائے گا۔

"نہیں..... ایسا نہیں ہو گا۔" وہ سر جھٹکنے لگا۔ اس نے سنیتا کی طرف دیکھا جو الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کک..... کچھ نہیں۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں اب بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کل رات میرے بارے میں پولیس کو اطلاع کس نے دی تھی۔"

"تم نے شاید وہ خبر پوری توجہ سے نہیں پڑھی۔" سنیتا نے کہا۔ "اس رپورٹ کے مطابق بشارت پولیس کو ایک سنگین جرم میں مطلوب تھا۔ استاد گنگو کے اڈے پر اس کی موجودگی کی اطلاع پا کر پولیس نے چھاپہ مارا تھا مگر وہ اپنے ایک ساتھی کو قتل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔"

"تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کسی سنگین جرم میں تمہارا مطلوب ہونا۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "تم کہتے ہو کہ تم نے جیب تراشی کے علاوہ اور کبھی کوئی ایسا سنگین جرم نہیں کیا لیکن کل دوپہر سے پہلے

تمہارے ہاتھوں دو بندے مارے گئے تھے۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں پولیس کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ فائرنگ شروع ہوتے ہی لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا تھا۔ کسی راہ گیر نے میری شکل دیکھی بھی ہو گی تو وہ یہ نہیں جانتا ہو گا کہ میں کون ہوں۔ شکرے کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اخبار کی اطلاع کے مطابق وہ کل رات تک ہوش میں نہیں آ سکا تھا۔ اس لئے یہ بات بھی نہیں سوچی جا سکتی کہ پولیس کو اس نے میرے بارے میں بتایا ہو گا۔ ویسے شکرے کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ وہ ہوش میں ہوتا بھی تو زبان نہ کھولتا۔"

"یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" سنیتا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تم پولیس کے طریقہ کار سے واقف نہیں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ شکرا ہوش میں آ گیا ہو اور پریس سے یہ بات چھپائی گئی ہو۔ جب کوئی زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہو تو وہ زندگی کی طرف جانے والا راستہ اپنانا چاہے گا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میرے بارے میں پولیس کو شکرے نے بتایا ہو گا۔" بشارت اسے گھورنے لگا۔

"زندگی ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔" سنیتا بولی۔ "شکرے کو چار گولیاں لگی تھیں۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ ہوش میں آ گیا ہو اور پولیس نے اسے ترغیب دی ہو کہ اگر وہ اپنے ساتھی کے بارے میں بتا دے تو اسے بچا لیا جائے گا اور زندگی کی امید پر اس نے تمہارا نام بتا دیا ہو۔"

"نہیں۔" بشارت نے کہا۔ "میں کئی سال سے شکرے کے ساتھ ہوں۔ اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ مجھے اگرچہ جرائم کی دنیا میں لانے والا وہی تھا لیکن ہمارے درمیان دوستی کا ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اپنی جان بھی دے سکتے تھے۔ نہیں سنیتا۔ شکرا ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مرنا قبول کر لے گا مگر میرا نام اس کی زبان پر نہیں آئے گا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں صرف اور صرف اسے بچانے کے لئے اس معاملے میں کودا تھا۔ وہ..... وہ....."

"ٹھیک ہے۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اگر تمہیں شکرے پر شبہ نہیں ہے

تو پھر یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ پولیس کو اطلاع دینے والا کون تھا لیکن ....."

"لیکن کیا؟" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چند روز تو تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔" سنیتا نے کہا۔ "ابھی معاملہ گرم ہے۔ پولیس تمہاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہو گی۔ کل تم نے باہر جا کر بہت سنگین غلطی کی تھی۔ قسمت اچھی تھی کہ بچ نکلے۔ اب تم ایسی کوئی غلطی نہیں کرو گے۔"

بشارت کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سنیتا نے کمرے میں آتے ہوئے دروازہ بھیڑ دیا تھا تاکہ ملازمہ ان کی باتیں نہ سن سکے۔

"آ جاؤ بی بی۔ دروازہ کھلا ہے۔" سنیتا نے کہا۔

دروازہ کھل گیا۔ بی بی نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ "ناشتہ لگاؤں سنیتا بیٹی۔"

"ہاں بی بی۔ تم ناشتہ لگاؤ۔ ہم آ رہے ہیں۔" سنیتا نے جواب دیا۔ اور بی بی واپس چلی گئی۔

"تمہیں شکرے پر اتنا ہی بھروسہ ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرے ذہن میں ایک اور تجویز تھی۔" سنیتا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"کیا؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہو سکتا ہے کہ شکرا ابھی تک واقعی ہوش میں نہ آیا ہو اور پولیس نے کسی اور چکر میں تمہارے نسبت روڈ والے اڈے پر چھاپہ مارا ہو۔" سنیتا نے ایک پراٹھا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "شکرا جب بھی ہوش میں آئے گا پولیس اس سے تمہارے بارے میں ضرور پوچھے گی۔ کچھ نفسیاتی حربے بھی استعمال کئے جائیں گے۔ شکرا ذہنی طور پر بھی اس پوزیشن میں نہیں ہو گا کہ اپنا دفاع کر سکے۔ اس لئے میرے خیال میں اس کی زبان کھولنے سے پہلے ہی....."

"کیا..... کیا کہنا چاہتی ہو؟" بشارت نے اسے گھورا۔

"اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے۔" سنیتا نے کہا۔

نوالہ بشارت کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں گر گیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے سنیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سنیتا نے یہ بات کہی تھی۔

"نہیں سنیتا۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا وہ میرا دوست

ہے اور میں اسے....."

"دیکھو بشارت۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "زندگی اور موت کا کھیل بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتا ہے۔ ہر شخص زندہ رہنا چاہتا ہے۔ کسی دوست کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے لیکن جان کی قربانی کوئی نہیں دیتا۔ اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے بعض اوقات دوسرے کی زندگی چھیننی پڑتی ہے۔ اس سے پہلے کہ شکرا تمہاری زندگی کا سودا کرے، تم اسے....."

"یہ نہیں ہو سکتا۔" بشارت نے اس کی بات قطع کر دی۔ "اگر تم اس بات سے خوفزدہ ہو کہ شکرا بچ گیا تو پولیس کو میرے بارے میں بتا دے گا اور پولیس مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں بھی پہنچ جائے گی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔"

"مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "اگر ڈر خوف ہوتا تو تمہیں پولیس کے گھیرے سے نکال کر یہاں نہ لاتی۔"

"تو پھر..... تم مجھے میرے دوست کو قتل کرنے پر کیوں اکسا رہی ہو؟" بشارت نے اسے گھورا۔

"میں تمہیں کسی کے قتل پر نہیں اکسا رہی۔" سنیتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ تم وفاداری میں کس حد تک جا سکتے ہو۔ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر دوست کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اب کسی ممکنہ خطرے کے باوجود تمہیں اپنے دوست کی زندگی خود سے زیادہ عزیز ہے۔ وفا نبھانے کے لئے تم کسی حد کے پابند نہیں ہو سکتے۔"

بشارت کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم جیسا دوست مل گیا۔" سنیتا نے کہا۔ "ناشتہ کرو۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

بشارت سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتے کے بعد سنیتا نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور وہ دونوں باہر آ کر برآمدے میں بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"اب یہ طے ہے کہ چند روز تک میرے لئے گھر سے باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔" بشارت نے کہا۔ "لیکن یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ پولیس کی سرگرمیاں کیا ہیں اور شکرا کس حال میں ہے۔"

"تم اطمینان رکھو۔ میں یہ سب معلوم کرلوں گی۔" سنیتا نے جواب دیا۔

بی بی بازار سے سودا لے کر آگئی تھی۔ اس نے ٹوکری اندر میز پر رکھ دی اور ناشتے کے جھوٹے برتن دھونے کے بعد گھر کی صفائی وغیرہ کرنے لگی۔

ایک گھنٹے بعد سنیتا تیار ہو کر چلی گئی۔ بشارت اس کے کمرے میں آگیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کے نچلے خانے میں خواتین کے کچھ پرانے ڈائجسٹ اور جاسوسی ناول پڑے ہوئے تھے۔ جرائم پیشہ گروہ میں ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ استاد گنگو کے اڈے پر تو اس نے انٹر کے کورس کی کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کسی امتحان میں شریک نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس نے اپنے طور پر تعلیم جاری رکھی تھی اور دوسری کتب وغیرہ کا مطالعہ بھی کرتا رہتا تھا۔

وہ جاسوسی ناول خاصا دلچسپ تھا وہ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ لینا چاہتا تھا لیکن نیند کے بوجھ سے اس کی پلکیں جھکنے لگیں اور وہ پڑھتے پڑھتے سو گیا۔

☆=====☆=====☆

"تمہارے لئے ایک دلچسپ اطلاع ہے۔" سنیتا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ آج بی بی تقریباً چھ بجے کے قریب گئی تھی۔ سنیتا اس وقت تک نہیں آئی تھی اور بی بی نے جانے سے پہلے بشارت کو جگا دیا تھا اور اب سنیتا کے آنے پر دروازہ بشارت ہی نے کھولا تھا۔ سنیتا نے کار برآمدے کے سامنے روکی تھی اور جب بشارت باہر کا گیٹ بند کر کے آیا تو سنیتا کار سے اتر رہی تھی۔

"وہ اطلاع یقیناً دلچسپ ہو گی اور سنسنی خیز بھی۔" بشارت نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ فی الوقت صورت حال ہی ایسی ہے کہ کوئی خبر دلچسپی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ تو وہ دلچسپ اطلاع کیا ہے؟"

"تمہارا دوست شکرا زندہ ہے۔" سنیتا نے جواب دیا۔

"کیا واقعی؟" بشارت اچھل پڑا۔

"آج کا سارا دن میں نے معلومات حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ میں گزارا ہے۔ بہت تھک گئی ہوں۔" سنیتا کہتے ہوئے برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر واقعی تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ "تمہارا دن کیسے گزرا؟"

"میں تو تمہارے جانے کے بعد سو گیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بی بی نے جگایا تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں ابھی کچن میں جانے والا تھا چائے بنانے کے لئے، پھر سوچا تمہارا انتظار کر لیا جائے۔"

"میں نے بھی ابھی چائے نہیں پی۔ تم بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" سنیتا کہتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

بشارت وہیں بیٹھا صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ سنیتا تقریباً آدھے گھنٹے بعد چائے بنا کر لائی تھی۔ اس نے دونوں کپ سامنے چھوٹی میز پر رکھ دیئے۔

"میں شکرے کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو رہا ہوں۔" بشارت نے اپنا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے سنیتا کی طرف دیکھا۔

"میں آج صبح سب سے پہلے اسپتال ہی گئی تھی۔" سنیتا نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "شکرا ابھی آپریشن تھیٹر ہی میں ہے۔ اس کے جسم سے تین گولیاں نکالی جا چکی ہیں۔ ایک ٹانگ سے اور دو پشت سے۔ ایک گولی ریڑھ کی ہڈی کے قریب لگی ہے۔ ابھی اس کے لئے آپریشن ہونا باقی ہے۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر بھی خاصے محتاط ہیں۔ شکرا ہوش میں آتا ہے اور پھر کوما میں چلا جاتا ہے۔ آخری گولی نکالنے کے لئے آج رات آپریشن ہو گا۔ شکرے کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر خاصے پُر امید ہیں۔ اسے بچا لیا جائے گا۔"

"اور کیا تمہارے خیال میں جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے پولیس کو میرا نام بتا دیا ہو گا۔" بشارت نے کہا۔

"نہیں۔ اسے آبزرویشن میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ پولیس کو بھی اس سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ اگر آج رات اس کا آخری آپریشن کامیاب ہو بھی گیا تو کم از کم ایک ہفتے تک پولیس کو اس کا بیان لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔" سنیتا نے بتایا۔

"تو پھر میرے بارے میں....."

"شکرے ہی نے بتایا تھا۔" سنیتا نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں سمجھا نہیں۔" بشارت کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لئے مجھے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہوئے میں نے ان نرسوں میں سے ایک نرس کو تلاش کر لیا جو اس وقت آپریشن تھیٹر میں ڈیوٹی پر تھی جب شکرے کو وہاں لایا گیا تھا۔" سنیتا چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "اس نرس کے کہنے کے مطابق آپریشن تھیٹر میں لائے جانے کے بعد شکرا چند منٹ کے لئے ہوش میں آیا تھا مگر اس کے حواس قابو میں نہیں تھے۔ وہ زیر لب بڑبڑ رہا تھا۔ غور سے سننے پر پتہ چلا کہ وہ نیم بے ہوشی میں تمہارا نام لے رہا تھا۔ ایک ڈاکٹر سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے آپریشن تھیٹر کے باہر موجود پولیس آفیسر کو بتا دیا اور کہا کہ بشارت اگر مریض کا بھائی یا قریبی عزیز ہے تو اسے تلاش کر کے لایا جائے۔ اس کی موجودگی مریض کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن گھاگ پولیس آفیسر نے اس کا کچھ اور نتیجہ اخذ کیا کہ بشارت اس کا وہ ساتھی تھا جو جائے واردات سے فرار ہو گیا تھا۔"

"ہوں۔ تو اس طرح پولیس تک میرا نام پہنچ گیا۔" بشارت بولا۔

"تمہیں ایک اور دلچسپی کی بات بتاؤں۔" سنیتا مسکرائی۔ "وہ پولیس آفیسر ایک اے ایس آئی تھا۔ اس نے دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد یہ معلوم کر لیا کہ شکرا جیب تراش ہے۔ اس نے شکرے کے اڈے کا پتہ چلا لیا اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ بشارت یعنی تم بھی وہیں رہتے ہو۔ اس پولیس آفیسر کا خیال تھا کہ اگر وہ تمہیں گرفتار کر لے تو اسے فوراً سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی مل جائے گی۔

"واردات رنگ محل کے علاقے میں ہوئی تھی۔ اس اے ایس آئی کا تعلق بھی اسی تھانے سے تھا جبکہ شکرے کا اڈہ نسبت روڈ پر واقع ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک علاقے کی پولیس جب کسی دوسرے علاقے میں چھاپہ مارتی ہے تو پہلے اس علاقے کے تھانے کو مطلع کیا جاتا ہے اور کارروائی کے لئے وہاں کی نفری بھی ساتھ لی جاتی ہے لیکن اس اے ایس آئی کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ تمہیں اپنے طور پر گرفتار کر کے پروموشن حاصل کرنا

چاہتا تھا۔ اس نے ساڑھے آٹھ بجے کے قریب وہاں چھاپہ مارا تھا۔ مقامی تھانے کو اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ تم اس وقت شکرے کے اڈے پر موجود نہیں تھے وہ دو اور لڑکوں کو پکڑ کر لے گیا اور مار پیٹ کر تمہارے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تم نو بجے کے قریب آتے ہو۔

"اس اے ایس آئی نے لڑکوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ تمہارا انتظار کرتا رہا۔ وہ تمہیں پہچانتا تو نہیں تھا لیکن جب تم اڈے میں داخل ہوئے تو نو بجے کے لگ بھگ کا وقت تھا۔ اس نے اڈے پر چڑھائی کر دی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا تمہارے ساتھ ہوا لیکن ایک بات جو تمہیں معلوم نہیں وہ یہ ہے کہ آج سہ پہر اس اے ایس آئی اور اس چھاپہ مار ٹیم میں شامل تمام اہلکاروں کو معطل کر کے حراست میں لے لیا گیا ہے۔"

"کیا.....؟" بشارت اچھل پڑا۔

"کل رات پریس کو جو خبر جاری کی گئی تھی اس میں یہی بتایا گیا تھا کہ تم اپنے ایک ساتھی کو قتل کر کے فرار ہو گئے تھے۔" سنیتا نے کہا۔ "لیکن آج صبح جو کچھ بھی ہوا وہ بالکل خلاف توقع تھا۔ ساری بات مقامی پولیس اسٹیشن کے انچارج پر آ رہی تھی۔ قتل اس کے علاقے میں ہوا تھا۔ اس نے چھاپہ مار پارٹی کے ایک بندے کو اعتماد میں لے کر اور کچھ لالچ دے کر پوچھا تو اس نے اصل بات بتا دی کہ جانو چاچا اے ایس آئی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور پھر لاش کے پوسٹ مارٹم سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی۔ جسم سے برآمد ہونے والی گولی اے ایس آئی کے پستول سے چلائی گئی تھی۔ انسپکٹر نے رپورٹ اپنے سینئرز کو دے دی۔ بات ڈی آئی جی تک پہنچ گئی اور ڈی آئی جی کے حکم پر آج سہ پہر اے ایس آئی اور اس کے ساتھیوں کو معطل کر کے حراست میں لے لیا گیا۔ مزید تحقیقات ہو گی اور اس اے ایس آئی پر قتل کا مقدمہ چلے گا۔"

"اوہ۔" بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ "لیکن میرا نام..... وہ تو بہرحال پولیس تک پہنچ گیا ہے۔"

"پولیس افسران کی میٹنگ میں یہ بات بھی زیر غور آئی تھی۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "شکرے نے نیم بدہوشی کی کیفیت میں بڑبڑانے والے انداز میں تمہارا نام لیا تھا۔ وہ اس

نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ نام شکرے کے بھائی یا کسی قریبی عزیز یا دوست کا جسے وہ جانکنی کی کیفیت میں یاد کر رہا تھا۔ کوئی حتمی نتیجہ اس وقت اخذ کیا جائے گا جب پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد بیان دے گا لیکن کم از کم ایک ہفتے تک ڈاکٹر پولیس کو اس کے قریب نہیں پھٹکنے دیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ایک ہفتے تک مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" بشارت نے کہا

"اب ایسی بھی اندھی نہیں لگ رہی۔" سنیتا نے کہا۔ "پولیس تمہیں بالکل ہی نظر انداز نہیں کرے گی۔ ہو سکتا ہے خفیہ طور پر تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس لئے چند روز تک تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے۔"

"ایک اور بات پر مجھے حیرت ہے۔" بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اتنی معلومات کیسے حاصل کر لیں۔ اسپتال سے بھی اور پولیس سے بھی۔"

"پیسے میں بڑی طاقت ہے۔" سنیتا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اور ایسا کرنے والی مجھ جیسی ہو تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

بشارت اسے گھور کر رہ گیا۔

"کیا تمہارے خیال میں ہوش میں آنے کے بعد شکرا تمہارے خلاف بیان دے گا؟" سنیتا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔" بشارت کے لہجے میں بھرپور اعتماد تھا۔ "شکرا دوستی سمجھتا ہے اور اس مقدس رشتے پر حرف نہیں آنے دے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" سنیتا بولی۔

اس وقت اندھیرا چھا گیا تھا۔ برآمدے کی بتی نہیں جلائی تھی۔ صحن میں پودوں اور مکان کے پچھلی طرف تالاب کی وجہ سے مچھروں کی بہتات تھی اور مچھر بڑی بیدردی سے ان دونوں کا خون چوس رہے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر آ گئے۔ بشارت تو ہال میں صوفے پر گیا اور سنیتا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ پون گھنٹے بعد باہر آئی تھی۔ وہ نہا کر تازہ دم بھی ہو گئی تھی اور کپڑے بھی لئے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وہ دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

"تمہارا یہ ٹیلی فون۔" بشارت نے دائیں طرف صوفے کے قریب اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا۔ "کل سے خاموش ہے۔ ایک مرتبہ بھی اس کی گھنٹی نہیں بجی اور تم نے بھی شاید اس کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"ٹیلی فون عدم ادائیگی کی وجہ سے بند پڑا ہے۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "مجھے ویسے اس کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی۔ اس مرتبہ بل جمع کرانے کا بھی خیال نہیں رہا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اب ہمیں ٹیلی فون کی ضرورت پڑے گی۔ کل صبح سب سے پہلے بل جمع کراؤں گی اور شام تک فون کھل جائے گا۔"

کھانے کے بعد وہ سنیتا والے کمرے میں آ گئے اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سنیتا جماہیاں لینے لگی تو بشارت اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ پہلے تو اس صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر وہ جاسوسی ناول اٹھا کر پڑھنے لگا جو دوپہر کو ادھورہ گیا تھا لیکن اس کا ذہن بٹ گیا تھا۔ پڑھنے پر بھی توجہ نہیں رہی تھی۔ وہ اب سنیتا کے بارے میں سوچنے لگا۔ سنیتا نے اپنے بارے میں بڑی سچائی سے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ اسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت تھی جو شبنم اور اس کے غنڈوں سے اسے تحفظ فراہم کر سکے اور اسے بشارت کی صورت میں اپنا آئیڈیل مل گیا تھا۔ اس نے بشارت پر بھروسہ کر لیا تھا اور بشارت سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس کی امیدوں پر پورا اتر سکے گا یا نہیں۔

بشارت کو ایسی باتوں کا تجربہ نہیں تھا لیکن یہ بات تو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شبنم جیسی عورتیں آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتیں۔ جوان اور حسین لڑکیاں ان کے لئے سونے کی کان ہوتی ہیں اور انہیں قبضے میں رکھنے کے لئے تو وہ اپنی جان کی بازی تک لگا دیتی ہیں۔

سنیتا کسی نہ کسی طرح شبنم کے شکنجے سے نکل آئی تھی اور وہ اپنے شوہر کی وجہ سے محفوظ رہی تھی لیکن شبنم کو جب یہ پتہ چلا کہ اس کا شوہر رفیق امریکہ کی جیل میں لمبی سزا بھگت رہا ہے تو اس نے ایک بار پھر سنیتا کو پھانسنے کے لئے جال پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ پہلے اسے شاندار زندگی اور دولت کی چمک سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہیں مانی تو دھمکیوں پر اتر آئی اور سنیتا اس سے بچنا چاہتی تھی۔ وہ دوبارہ گندگی کی اس

دلدل میں نہیں جانا چاہتی تھی جس سے بڑی مشکل سے نکل تھی۔ شبنم جیسی عورت سے بچنے کے لئے اس نے بشارت کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بشارت کی دلیری سے بے حد متاثر ہوئی تھی جس نے اپنے دوست کو بچانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور پلک جھپکنے کی دیر میں دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سنیا کو اپنی حفاظت کے لئے یقیناً ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی اور بشارت سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس کی امیدوں پر پورا اتر سکے گا جبکہ وہ خود پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس ابھی مخمصے کا شکار تھی لیکن جب تصدیق ہو جائے گی کہ ان دو آدمیوں کا قاتل وہی ہے تو بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش شروع ہوجائے گی اور اسے کہیں ٹکنے نہیں دیا جائے گا۔ اسے تو اپنے آپ کو بچانے کی فکر ہو گی۔ کسی اور کی وہ کیا مدد کر سکے گا۔

سنیا جوان تھی اور بے حد حسین تھی۔ آج صبح سویرے بشارت نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا اس کا تصور کرتے ہوئے اسے جھرجھری سی آگئی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے سر جھٹکتے ہوئے ایک بار پھر ناول اٹھالیا اور سنیا کا خیال ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخری مرتبہ اس نے گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ شاید خواب دیکھ رہا تھا۔ سنیا اس پر جھکی بڑے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اور پھر ایک مدھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "دس بج رہے ہیں۔ اب اٹھ جاؤ۔"

بشارت نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس کا خواب نہیں تھا۔ سنیا پلنگ کی پٹی پر بیٹھی اس کی طرف جھکی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس نے وہی باریک شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

مخروطی اور مرمریں انگلیوں کے لمس نے بشارت کے جسم میں بجلی سی دوڑادی۔ ایک عجیب سا احساس دل کی گہرائیوں سے اٹھا اور پورے بدن میں سنسنی سی پیدا کرتا ہوا دماغ پر چلا گیا۔ بے اختیار اس نے سنیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دل میں پیدا ہونے والے احساس کی لطافت بڑھ گئی۔ سینے میں عجیب سے جذبات لہریں لینے لگے۔

اس کا ماضی دکھوں اور غموں کے کانٹوں میں الجھا ہوا گزرا تھا۔ اپنی زندگی میں کبھی

اسے کسی نازک ہستی کا قرب حاصل نہیں ہوا تھا۔ کبھی اس کے دل میں یہ خیال تک نہیں ابھرا تھا کہ زندگی میں آہوں اور سسکیوں کے علاوہ بھی کچھ ہے لیکن آج ایک نرم و ملائم اور شگفتہ ہستی کے قرب اور اس کے ہاتھ کے لمس نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے دل میں لطیف جذبات سر ابھارنے لگے۔ ایسے جذبات جن کا مفہوم وہ خود بھی نہیں سمجھتا تھا۔

"چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" سنیا اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

بشارت کے تصورات کی حسین عمارت ریت کے گھروندے کی طرح ڈھیر ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور نظریں ندامت سے جھک گئیں۔ سنیا نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بشارت اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے مدھم سے لہجے میں بولا۔ "بی بی ابھی تک نہیں آئی کیا؟"

"آج بی بی کی چھٹی ہے۔" سنیا کہتے ہوئے بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنا کپ اٹھالیا۔ "جس دن بی بی کی چھٹی ہوتی ہے سارا کام مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔"

سنیا شوخ نظروں سے بشارت کی طرف دیکھ رہی تھی اور بشارت ندامت اور شرم کے مارے نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

دونوں کی چائے ختم ہو چکی تھی۔ سنیا خالی کپ اٹھا کر چلی گئی۔ بشارت اپنی جگہ پر بیٹھا رہا' اور پھر اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر باہر نکلا تو سنیا کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس وقت اس نے ڈھنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بشارت نے ہال میں صوفے پر بیٹھے ہوئے اخبار اٹھالیا۔ آخری صفحے پر پولیس کی چھاپہ مار ٹیم کی معطلی اور اے ایس آئی کو حراست میں لئے جانے کی خبر تھی۔ اس صفحے پر ایک اور خبر بھی تھی۔ زیر حراست زخمی ملزم شکرے کے جسم سے آپریشن کرکے آخری گولی بھی نکال دی گئی تھی جس سے اس کی حالت بگڑ گئی تھی اور ڈاکٹروں کے مطابق اگلے اڑتالیس گھنٹے بہت اہم تھے۔ اگر اس نے اڑتالیس گھنٹے نکال لئے تو اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ پولیس بڑی سرگرمی سے اس کے دوسرے ساتھی کو

تلاش کر رہی تھی لیکن اس سلسلے میں ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔

ناشتے کے بعد سنیتا بازار چلی گئی اور اس کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔

"فون کا بل جمع کروا دیا ہے۔ شام تک لائن کھل جائے گی۔ اور یہ تمہارے لئے لے کر آئی ہوں۔" اس نے شاپنگ بیگ میں سے ایک پیکٹ نکال کر بشارت کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کھول کر دیکھ لو۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "ویسے میرا خیال ہے تمہیں اس چیز کی ضرورت ہے۔"

بشارت خوبصورت کاغذ میں لپٹے ہوئے پیکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر بڑے سلیقے سے کاغذ اتار دیا۔ وہ ایک خوبصورت چرمی شیونگ بکس تھا جس میں اس حوالے سے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

"اس تحفے کا شکریہ۔" اس نے بکس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے بلاوجہ زحمت کی۔"

"تم نے دو تین دن سے شیو نہیں بنایا۔ میں نے سوچا تمہیں اس کی ضرورت ہو گی۔" سنیتا نے کہا۔

"لیکن فی الحال اسے استعمال کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔

"کیوں..... مولوی بننے کا ارادہ ہے کیا؟" سنیتا مسکرائی۔

"میں ساری زندگی اس چار دیواری میں قید ہو کر تو نہیں رہ سکتا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "باہر نکلنے کے لئے مجھے حلیہ بدلنا ہو گا اور اگر میں داڑھی رکھ لوں تو میرے چہرے میں خاصی تبدیلی آ جائے گی۔"

"اوہ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" سنیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ "داڑھی بڑھا کر تمہارے چہرے پر واقعی بڑی تبدیلی آ جائے گی۔ ویسے تم داڑھی رکھ کر بھی اسمارٹ لگو گے۔ تم نے حلیے کی بات کی ہے تو میرے ذہن میں کچھ اور باتیں بھی آ رہی ہیں۔ مثلاً....." وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"مثلاً بالوں کا اسٹائل تبدیل ہو جائے اور آنکھوں میں لینس لگ جائیں تو بشارت کی حیثیت سے تمہیں کوئی پہچان ہی نہیں سکے گا۔"

بشارت کی آنکھوں میں بھی چمک سی ابھر آئی۔ لینس کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

تین چار روز اور گزر گئے۔ اس دوران میں بشارت نے گھر سے باہر جھانکا تک نہیں تھا۔ اس کی داڑھی کے بال اچھے خاصے بڑھ گئے تھے جسے اس نے سلیقے سے سیٹ کر لیا۔ ہلکی مونچھیں اور گول داڑھی اس کے چہرے پر واقعی خوب جچ رہی تھی۔

سنیتا باہر کی صورت حال پر نگاہ رکھے ہوئے تھی لیکن کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ پولیس کی سرگرمیاں اب بتدریج سرد پڑ رہی تھیں۔ شکرے کی حالت بھی اب خطرے سے باہر تھی اور اسے کئی روز ایمرجنسی میں رکھنے کے بعد وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور دو مسلح کانسٹیبل اس کی نگرانی کے لئے تعینات کر دیئے گئے تھے۔ سنیتا نے وارڈ میں ڈیوٹی دینے والی ایک نرس کو بھاری رقم دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ شکرے کی حالت سے اسے باخبر رکھے گی۔ اس نرس کی ڈیوٹی شام سات بجے ختم ہوتی تھی۔ سنیتا چھ بجے اسپتال پہنچ جاتی۔ اس وقت اسپتال میں مریضوں کے عزیز و اقارب کی آمدورفت بھی جاری رہتی تھی۔ اس لئے سنیتا کو اس نرس سے ملنے اور رپورٹ حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی اور کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ نرس کی رپورٹ کے مطابق ڈاکٹروں نے ابھی تک پولیس کو شکرے کا بیان لینے کی اجازت نہیں دی تھی۔

اس روز بشارت کئی روز بعد پہلی مرتبہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اگر اسے پہچان لیا گیا تو.....؟ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ سنیتا اسے سمن آباد میں واقع ایک آپٹکس کی دکان پر لے گئی۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ اس دکان سے باہر نکلا تو اس کی ہیئت ہی بدلی ہوئی تھی۔ نیلی آنکھوں نے اس کے چہرے کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ سنیتا بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ واپسی پر چوہدری سے ذرا آگے نکل کر سنیتا نے

ایک طرف گاڑی روک لی اور انجن بند کر دیا۔

بائیں طرف خان صاحب کی تکے کباب کی دکان تھی۔ لوگ دور دور سے کباب کھانے کے لئے یہاں آتے تھے۔ اگرچہ بہت بڑا ایئرکنڈیشنڈ ہال بھی تھا لیکن دکان کے سامنے کھلی جگہ پر دور دور تک میزیں، کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کوئی میز خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ درجنوں کاریں بھی کھڑی تھیں اور بہت سے لوگ اپنی گاڑیوں میں بیٹھے لذت کام و دہن میں مشغول تھے۔

سنیتا کے کار روکنے کے فوراً ہی بعد ایک نوجوان ہاتھ میں خالی ٹرے پکڑے ان کے قریب آ گیا اور چیزوں کے نام گنوانے لگا۔ سنیتا نے اسے چکن تکے اور روغنی نان کا آرڈر دے دیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ بشارت بھی کار سے باہر آ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے چوبرجی مارکیٹ میں تکے کباب کی دو تین دکانیں تھیں اور وہاں بھی ایسا ہی رش نظر آ رہا تھا۔ انگریزی کے حرف وائے کی شکل بناتی ہوئی دو سڑکوں کے بیچ میں بہت بڑا پارک تھا اور خان صاحب کی دکان کے بالکل سامنے پارک کے گوشے میں پی آئی اے کا پلانیٹوریم تھا جہاں لوگوں کی تفریح کے لئے پرواز کی صلاحیتوں سے محروم ہو جانے والا ایک جہاز بھی کھڑا کر دیا گیا تھا جو لوگ ہوائی سفر کی استطاعت نہیں رکھتے تھے وہ اس جہاز میں بیٹھ کر اپنا شوق پورا کر لیا کرتے تھے۔

پندرہ منٹ بعد لڑکا ان کی مطلوبہ چیزیں لے آیا۔ سنیتا نے پلیٹیں کار کے بونٹ پر ہی رکھوا لیں اور دونوں وہیں کھڑے کھڑے کھانا کھانے لگے۔ بشارت اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہا تھا۔ میزوں پر اگرچہ کئی خواتین بھی بیٹھی ہوئی تھیں لیکن بشارت نے محسوس کیا تھا کہ اکثر لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک موقع پر بائیں طرف دیکھتے ہوئے بشارت چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ دو آدمی تھے جو بڑی گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شکل و صورت سے وہ دونوں چھٹے ہوئے بدمعاش ہی لگتے تھے اور ان میں سے ایک کا چہرہ اسے کچھ جانا سا لگ رہا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ دونوں ان کی طرف دیکھتے ہوئے آپس میں سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد سنیتا نے بل ادا کیا اور وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ سنیتا نے انجن

اسٹارٹ کیا اور کار کو وہیں سے گھما کر چوبرجی چوک کی طرف لے آئی اور وہاں سے کار کو بہاولپور روڈ پر موڑ دیا۔

"اس طرف کہاں جا رہی ہو؟" بشارت نے پوچھا۔

"شپل روڈ پر ذرا کام ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" سنیتا نے جواب دیا۔

اس سڑک کے دونوں طرف وسیع و عریض قبرستان تھے۔ شہر کے مشرقی حصے کو ملتان روڈ سے ملانے والی اس سڑک پر دن میں اور رات آٹھ نو بجے تک اچھا خاصا ٹریفک رہتا تھا لیکن اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور اکا دکا گاڑیوں ہی کی آمدورفت تھی۔

بشارت نے اس جیپ کو دیکھ لیا تھا جو وہاں سے روانہ ہوتے ہی ان کے پیچھے لگ گئی تھی اور اس نے ان دونوں آدمیوں کو اس جیپ میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا جو کھانا کھانے کے دوران میں انہیں گھورتے رہے تھے۔

"سنیتا۔" بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک جیپ ہمارے پیچھے آ رہی ہے اور وہ دونوں مجھے کوئی شریف آدمی نہیں لگتے۔"

سنیتا نے سامنے لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف دیکھا۔ وہ جیپ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ اس جیپ کے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی اور اتفاق سے سامنے بھی سڑک دور تک خالی تھی۔

اچانک جیپ کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ کار کو اوور ٹیک کرتی ہوئی ایک دم سامنے آ گئی۔ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز فضا میں پھیل گئی۔ سنیتا نے بڑی تیزی سے اسٹیئرنگ بائیں طرف گھما دیا۔ اس جگہ قبرستان میں داخلے کا راستہ تھا جہاں لکڑی کے تختوں کا معمولی سا گیٹ لگا ہوا تھا۔ کار گیٹ توڑتی ہوئی اندر داخل ہو کر ایک قبر سے ٹکرا گئی۔ اگر سنیتا پوری قوت سے بریک نہ لگا دیتی تو کار قبر پر چڑھ کر الٹ جاتی۔

بشارت کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا لیکن اس نے اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا اور سنیتا کی طرف دیکھنے لگا۔ خوف و دہشت سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر اچھل پڑا۔

وہ دونوں آدمی جیپ سے اتر کر اسی طرف دوڑتے آ رہے تھے۔ بشارت جلدی سے دروازہ کھول کر کار سے اتر آیا۔ ان میں سے ایک آدمی آگے پہنچ گیا اور کار کا دروازہ کھول کر سنیا کو باہر کھینچنے لگا۔ سنیا چیخ اٹھی۔ بشارت جلدی سے آگے بڑھا۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا مولوی۔" دوسرا آدمی چیخا۔

اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر بشارت رک گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے چاقو کی پروا کئے بغیر اس شخص پر حملہ کر دیا۔ اس کے پیر کی ٹھوکر اس شخص کے چاقو والے ہاتھ پر لگی اور چاقو ہوا میں اڑتا ہوا قبروں میں جا گرا۔ اس غنڈے کو شاید اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک لمحے کو تو بھونچکا سا رہ گیا۔ پھر اس نے اچانک ہی بشارت پر حملہ کر دیا۔ بشارت نے بچنے کی کوشش کی مگر گھونسہ اس کے کندھے پر لگا۔

بشارت کو یوں لگا جیسے وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی حریف نے اسے گھونسوں کی باڑ پر رکھ لیا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش ہونے لگی۔

بشارت نے حریف کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ ایک پیر پر ناچ کر رہ گیا اور پھر پشت کے بل گرا۔ بشارت ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے حریف نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے ایک بار پھر بشارت پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ بشارت ابھی تک اسے ایک ہاتھ بھی نہیں مار سکا تھا۔

ایک گھونسہ بشارت کے منہ پر لگا۔ ہونٹوں سے خون بہہ نکلا اور منہ میں اپنے خون کا ذائقہ محسوس کر کے بشارت کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی رگوں میں خون لاوے کی طرح کھول اٹھا ہو۔ حریف نے دوسرا گھونسہ مارنا چاہا تو بشارت نے اس کا وار بائیں ہاتھ پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کی بغل میں زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ وہ شخص گیند کی طرح اچھلا۔ بشارت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کے منہ پر گھونسوں کی بارش کر دی۔

وہ لڑائی کا ماہر نہیں تھا لیکن جب اپنی جان پر بنی ہو تو ہر کوئی ہاتھ پیر چلانا سیکھ لیتا ہے۔ اس کا ایک گھونسہ حریف کی ناک پر لگا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ بشارت اسے گھونسے اور ٹھوکریں مارتا ہوا قبروں

میں دھکیل لے گیا۔ اس کا آخری گھونسہ حریف کے سر پر لگا۔ وہ چیختا ہوا پشت کے بل ایک قبر پر گرا۔

اسی لمحے بشارت کو سنیا کی چیخ سنائی دی۔ بشارت اس طرف لپکا۔ سنیا نے اپنا ایک بازو اسٹیئرنگ وہیل میں پھنسا رکھا تھا اور وہ شخص اسے بالوں سے پکڑ کر باہر گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ سنیا کے کندھے پر گھونسے بھی مار رہا تھا۔

اسی وقت سڑک پر سے کوئی گاڑی بھی گزری تھی۔ گاڑی تیزی سے نکل گئی تھی۔ کسی نے سنیا کی چیخ نہیں سنی ہو گی۔ سنی بھی ہو گی تو جان بوجھ کر نہیں رکا ہو گا۔ رات کے وقت تو کسی قبرستان کے قریب سے گزرتے ہوئے ویسے ہی خوف محسوس ہوتا ہے اور جب قبرستان میں کسی عورت کے چیخنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی ہوں تو وہاں رکنے کی حماقت کون کرے گا۔

بشارت نے اس شخص کو بالوں سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پسلیوں پر دو تین گھونسے جڑ دیئے۔ اس شخص نے سنیا کے بال چھوڑ دیئے۔

"دیکھ او باؤ۔" وہ غنڈہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ساڈا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تُو چپ کر کے پھُٹ جا یہاں سے۔ ساڈے نال پنگا نہ لے تُو۔"

"پنگا تو اب میں لے ہی چکا ہوں۔" بشارت نے جواب دیا۔ "اور اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

بشارت نے گھونسہ مارنے کی کوشش کی مگر حریف نے جھکائی دے کر اپنے آپ کو بچا لیا اور اس کے ساتھ ہی ٹانگ چلا دی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر بشارت کی پنڈلی پر لگی۔ وہ بلبلا کر اٹھا اور لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ حریف نے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے چھاپ لیا۔ وہ بشارت کے سینے پر سوار تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ بشارت کے نرخرے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ بشارت کا سانس رکنے لگا۔ آنکھیں حلقوں سے ابل آئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ حریف کی کلائیوں پر جما رکھے تھے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لگتا تھا جیسے اس کی قوت مدافعت جواب دے رہی ہو۔

بشارت آہستہ آہستہ اپنی ایک ٹانگ سمیٹنے لگا اور آخر کار اس پوزیشن میں آ گیا کہ حریف کے خلاف ٹانگ استعمال کر سکے۔ اس نے گھٹنے سے حریف کی ناف کے نازک حصے

پر ضرب لگائی۔ ضرب اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھی لیکن اثر دکھا گئی تھی۔ حریف ذرا سا اچھلا۔ بشارت کو موقع مل گیا۔ اس مرتبہ اس نے گھٹنے سے اسی جگہ زوردار ضرب لگائی۔

حریف بلبلا اٹھا۔ بشارت کے گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بشارت نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحے اپنا گلا سہلاتا رہا پھر حریف کی طرف متوجہ ہو گیا جو دونوں ہاتھ رانوں میں دبائے دہرا ہوا جا رہا تھا۔

بشارت نے اس کے پہلو پر زور دار ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ چیختا ہوا الٹ گیا اور بشارت کی ماں بہن سے اپنے رشتے جوڑنے لگا۔ بشارت اس پر ٹھوکریں برساتا رہا۔

اس دوران میں دوسرا غنڈہ بھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے بشارت پر حملہ کر دیا۔ بشارت اس کے دہاڑنے کی آواز سن کر بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا اور وہ شخص اس کے اوپر سے ہوتا ہوا آگے جا گرا۔

بشارت نے اب دونوں کو ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کی زوردار ٹھوکر ایک کے سر پر لگی۔ وہ چیخ اٹھا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زمین پر لوٹنے لگا۔ دوسرا آدمی بشارت سے گتھم گتھا ہو گیا۔

وہ دونوں قبروں میں ایک دوسرے کو رگیدتے رہے۔ بشارت اس کے سینے پر سوار اس کے منہ پر گھونسے برسا رہا تھا۔ "بشارت بچو.....!"

سنیتا کے چیخنے کی آواز سن کر بشارت نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک طرف جھکائی لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔

دوسرا آدمی دونوں ہاتھوں میں بہت بڑا پتھر اٹھائے حملہ آور ہو رہا تھا۔ بشارت تو ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا پتھر بڑی تیزی سے نیچے آیا اور اس کے ساتھ ہی نیچے پڑے ہوئے شخص کی بھیانک چیخ قبرستان کے سناٹے میں گونج اٹھی مگر اس چیخ نے اچانک ہی دم توڑ دیا تھا۔ وزنی پتھر نے اس کا سر کچل دیا تھا۔

حملہ آور چند لمحے دہشت زدہ سی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا اور پھر چیختا ہوا قبروں میں ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

بشارت نے نیچے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا جس کا چہرہ بری طرح کچلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ وہ اٹھ کر سنیتا کی طرف لپکا جو کار کے بونٹ سے

ٹیک لگائے کھڑی دہشت زدہ سی نظروں سے اس لاش کو دیکھ رہی تھی۔

"تت..... تم..... ٹھیک ہو نا.....!" وہ بشارت کی طرف دیکھ کر ہکلائی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھالو اور نکلو یہاں سے۔" بشارت نے آستین سے اپنے ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔ "گاڑی چلا سکو گی یا نہیں؟"

"ہاں ہاں۔ میں چلا لوں گی۔" سنیتا نے جواب دیا۔

بشارت نے اسے پکڑ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا اور خود اوپر سے گھوم کر پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سنیتا انجن اسٹارٹ کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ لکڑی کا گیٹ توڑنے اور قبر سے ٹکرانے سے گاڑی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ انجن آسانی سے اسٹارٹ ہو گیا۔

"اپنے حواس کو قابو میں رکھو اور گاڑی کو احتیاط سے ریورس میں لو۔" بشارت نے کہا۔ "ہیڈ لیمپس روشن کرنے کی ضرورت نہیں۔"

سنیتا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کار کو ریورس میں لینے لگی۔ پیچھے سڑک پر تاریکی تھی جس کا مطلب تھا کہ کسی طرف سے کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ لکڑی کا گیٹ ٹوٹ کر جھول گیا تھا۔ کار اس سے ٹکراتی ہوئی باہر آ گئی۔ وہ سڑک کے کنارے کچی جگہ پر گاڑی کو کئی گز دور لیتی چلی گئی۔ پھر گیئر بدل کر اسے آگے کی طرف دوڑا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیڈ لیمپس روشن کر دیئے تھے۔ وہ جیپ چند گز آگے کھڑی تھی۔ سنیتا کار کو اس کے قریب سے نکال لے گئی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے۔ کار کبھی سڑک کے کنارے پر آ جاتی اور کبھی بیچ میں۔

تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ سامنے سے کوئی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی آنکھیں میں چکا چوند سی پیدا کر رہی تھی۔ سنیتا نے اپنی کار کی رفتار کم کر کے اسے بالکل کنارے پر لے لیا۔

وہ پولیس کی پیٹرولنگ وین تھی جو تیزی سے گزر گئی۔ سنیتا کے ہاتھ ایک بار پھر اسٹیئرنگ پر کانپ گئے۔

"گاڑی سنبھالو۔" بشارت جلدی سے بول اٹھا۔

کار سڑک سے اتر کر قبرستان کی دیوار کی طرف جا رہی تھی۔ سنیتا نے جلدی سے

اسے سنبھال لیا اور دوبارہ سڑک پر لے آئی۔ "اگر وہ ہمیں روک لیتے تو ہمارے حلیے دیکھ کر مشکوک ہو جاتے۔" سنیتا نے کہا۔

"جیپ کو وہاں کھڑے دیکھ کر شاید پولیس کی گاڑی وہاں رک جائے۔" بشارت نے کہا۔ "اس لئے رفتار ذرا بڑھا دو۔"

سنیتا نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے پر نگاہ ڈالی اور کار کی رفتار بڑھا دی اگلے چوراہے پر ٹریفک سگنل کی زرد بتی جل بجھ رہی تھی۔ لٹن روڈ، شاہراہ جلال الدین رومی اور فاطمہ جناح روڈ پر ہلکے ٹریفک کی آمدورفت جاری تھی۔

"پولیس کی وہ گاڑی جیپ کے پاس رک گئی ہے۔" بشارت نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

سنیتا کانپ اٹھی۔ اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مضبوطی سے جما لئے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے گاڑی کو چوراہے سے سیدھا فاطمہ جناح روڈ پر لے گئی اور تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ٹمپل روڈ پر موڑ دیا۔

بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جہاں ریسٹورنٹ کھانے پینے کی دکانیں تھیں خاصی رونق تھی۔ اس سڑک پر دوسری گاڑیوں کی آمدورفت بھی تھی۔ سنیتا محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرتی رہی۔

ریگل چوک سے تقریباً سو گز پہلے اس نے کار بائیں طرف ایک گلی میں موڑ کر روک لی اور انجن بند کر کے شیشے چڑھانے لگی۔ بشارت نے بھی اپنی طرف کا شیشہ چڑھایا اور وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ سنیتا اپنا شولڈر بیگ اٹھانا نہیں بھولی تھی۔

سنیتا اسی گلی کی پہلی بلڈنگ کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ یہ کشادہ ڈیوڑھی تھی جس میں آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے اختتام پر سیڑھیاں اور دروازے کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لئے تنگ سی سیڑھیاں۔ سنیتا سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ بشارت بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔

دوسری منزل پر سنیتا ایک کمرے کے سامنے رک گئی۔ اس نے شولڈر بیگ میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور دروازے کا تالا کھولنے لگی۔

اندر داخل ہونے کے بعد سنیتا نے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر دیوار سٹول کو

جلا دی۔

یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں ایک طرف چھوٹی آفس ٹیبل اور کرسی رکھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف لاتعداد کارٹن نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لمبے چوڑے شیشے کے دروازے والی الماری بنی ہوئی تھی جس میں کاسمیٹکس کا سامان اور الیکٹرانک کی کچھ چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

آگے ایک اور دروازہ تھا جو مقفل نہیں تھا۔ سنیتا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی اور بتی جلا دی۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے کی طرح کشادہ تھا۔ فرش پر نیلے رنگ کی موٹی دری بچھی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ایک طرف آفس ٹیبل تھی اور اس کے پیچھے ریوالونگ چیئر، سامنے والی دو دیواروں کے ساتھ نیچے سے اوپر تک شیشے کی الماریاں بنی ہوئی تھیں اور ان میں بھی انواع و اقسام کا مال سجا ہوا تھا۔

اس کمرے کی ایک کھڑکی گلی کی طرف اور دوسری سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ سنیتا نے اندر داخل ہو کر دونوں کھڑکیاں کھول دیں اور میز کے پہلو میں ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ باتھ روم تھا جس میں سامنے ہی دیوار کے ساتھ ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔

بشارت کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف صوفہ سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور انگلی سے ہونٹوں کو ٹٹولنے لگا۔ اسی وقت سنیتا باتھ روم سے باہر نکلی اور ایک الماری کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ پھر اس نے اینٹی سیپٹک لوشن کی ایک بوتل اٹھالی۔

بشارت بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ سنیتا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے اور گلے پر خراشیں تھیں۔ قمیص ایک کندھے سے پھٹی ہوئی تھی اور کندھے پر بھی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے باتھ روم میں داخل ہو کر دروازے کو پیر سے پیچھے کی طرف دھکیل دیا اور قمیص اتار کر چہرے اور جسم کی خراشوں پر لوشن لگانے لگی۔

بشارت صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کی نظریں اچانک ہی باتھ روم کی طرف اٹھ گئیں اور پھر اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ باتھ روم کا دروازہ پوری طرح بند نہیں ہوا تھا۔ چند انچ کے قریب کھلا رہ گیا تھا اور اس خلا سے سنیتا کو دیکھ کر اس

کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تازہ ہوا کے جھونکوں سے اس کے حواس بحال ہونے لگے۔ وہ گردن کھڑکی سے نکالے گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور پھر سنیتا کی آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے جامے میں آچکی تھی۔

"تمہارا ہونٹ شاید کٹ گیا ہے۔ یہ لوشن لگا لو۔ اور دیکھو تمہارا حلیہ کیا ہو رہا ہے۔" سنیتا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بشارت نے پہلی مرتبہ اپنا جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ واقعی بہت خستہ ہو رہا تھا۔ کپڑے مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ شرٹ کا اوپر کا ایک بٹن بھی ٹوٹا تھا اور خون کے چند دھبے بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر راستے میں انہیں واقعی کہیں روک لیا جاتا تو ان کا شبہ ہونا لازمی بات تھی۔

وہ لوشن کی بوتل اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ منہ ہاتھ دھو کر ہونٹوں کے کٹ پر لوشن لگا لے لیکن آئینے میں اپنا جائزہ لینے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے کپڑے اتارنے لگا۔ اس کے بال بھی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔

نہانے کے بعد اس نے پینٹ اور بنیان پہن لی اور قمیص ہاتھ میں اٹھائے باہر آگیا۔

"یہ قمیص پہن کر تو میں باہر نہیں جاسکتا۔" وہ سنیتا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "خون کے دھبے لگے ہوئے ہیں۔ راستے میں کسی جگہ روک لیا گیا تو مشکل ہو جائے گی۔"

"ہم کہیں جا بھی نہیں رہے۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "ایک بجنے والا ہے۔ راستے میں کہیں نہ کہیں پولیس ضرور روکے گی اور میری ذہنی کیفیت ایسی نہیں کہ پولیس کے سوالوں کا جواب دے سکوں۔"

"یہاں..... یہ کون سی جگہ ہے؟" بشارت نے پوچھا۔

"میرا بزنس آفس۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "ہم رات یہیں رہیں گے۔"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر زوردار دستک ابھری۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ سنیتا کا چہرہ تو ایک دم دھواں ہو گیا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

"کون ہے؟" اس نے بیرونی دروازے کے قریب آکر پوچھا۔

"چوکیدار۔ اندر کون ہے۔" باہر سے پوچھا گیا۔

سنیتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے بولٹ ہٹا کر دروازہ ذرا سا کھول دیا۔

"میں ہوں چوکیدار۔ کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آپ ہیں بیگم صاحب۔" چوکیدار بولا۔ "بتی جلتے دیکھی تو میں سمجھا پتہ نہیں کون ہے۔ خیر تو ہے نا بیگم صاحب۔"

"دفتر کا مہینے بھر کا حساب کرنا تھا۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "جب میں آئی تھی تو اس وقت تم کہاں تھے؟"

"وکیل صاحب کے لئے ہوٹل سے روٹی لینے گیا ہوا تھا۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "آج وہ بھی ابھی تک بیٹھے ہوئے ہیں جی۔ صبح کچہری میں کوئی مقدمہ لڑنا ہے۔"

"اچھا ایسا کرو، تم جس ہوٹل سے وکیل صاحب کے لئے روٹی لے کر آئے ہو وہاں سے مجھے بھی چائے لادو۔ مجھے یاد نہیں رہا ورنہ میں تھرماس بھر کے لے آتی۔ تمہیں ذرا تکلیف تو ہوگی۔ میں....."

"کوئی گل ای نہیں بیگم صاحب۔" چوکیدار نے کہا۔

سنیتا نے اسے بیس روپے لا کر دے دیئے اور یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی چائے پی آئے اور دو آدمیوں کی چائے اس کے لئے لے آئے۔

چوکیدار کے جانے کے بعد سنیتا نے دروازہ بند کر دیا اور بشارت کو بتانے لگی کہ اس دو منزلہ عمارت میں زیادہ تر وکیلوں کے دفاتر ہیں جو عام طور پر رات آٹھ نو بجے تک بند ہو جاتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھار کوئی وکیل کسی کیس کی اسٹڈی کے لئے رات بھر اپنے دفتر میں بیٹھا رہتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد چوکیدار چائے کی چینک اور دو پیالیاں لے آیا۔ سنیتا نے اسے بتا دیا کہ چینک وہ صبح واپس لے جائے۔ وہ دروازہ بند کر کے اندرونی کمرے میں آگئی۔ وہ دونوں اس وقت واقعی بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہے تھے۔

"کس بیدردی سے اس کا تھوبڑا کچلا گیا تھا۔ میرا دل تو ابھی تک کانپ رہا ہے۔" سنیتا نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"کون تھے وہ لوگ؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے والی تھی۔" سنیتا بولی۔ "وہ جو کوئی بھی ہوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرا انتخاب غلط نہیں تھا۔ میں نے اسی روز تمہارے اندر چھپے ہوئے آدمی کو پہچان لیا تھا جب اپنے دوست کو بچانے کے لئے تم نے جان کی بازی لگا دی تھی۔"

"آدمی کو یا میرے اندر کے چھپے ہوئے حیوان کو پہچان لیا تھا۔" بشارت نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر اس شخص کی جگہ میرا تھوبڑا کچلا جاتا تو تم میرے انتخاب کو زندگی کی سنگین ترین غلطی قرار دیتیں۔ بہر حال۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "ان دونوں کو میں نے اس وقت دیکھا تھا جب ہم خان صاحب کے ہاں تکے کباب کھا رہے تھے۔ یہ دونوں بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے اور بار بار تمہاری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اسی وقت ان پر شبہ ہوا تھا اور جب انہوں نے جیپ پر ہمارا تعاقب شروع کر دیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا یہ شبنم کے غنڈے نہیں ہو سکتے۔ تم نے بتایا تھا کہ اس نے تمہیں اٹھوانے کی دھمکی دی تھی؟"

"اگر یہ شبنم ہی کے گرگے تھے تو اب تک اسے پتہ چل گیا ہو گا کہ اب میری طرف میلی آنکھ سے دیکھنا بھی خطرناک ہو گا۔" سنیتا نے جواب دیا۔

"کیونکہ اب تمہیں ایک ایسا حیوان مل گیا ہے جو کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔" بشارت نے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو؟" سنیتا نے اسے گھورا۔

"میرا باپ مجھے کیا بنانا چاہتا تھا اور میں کیا بن گیا۔" بشارت نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ وقت کے دھارے نے میری کشتی حیات کو طوفانی موجوں میں دھکیل دیا ہے۔ پتوار میرے ہاتھ سے چھوٹ چکے ہیں۔ اتنی قوت نہیں کہ اپنی ڈولتی ہوئی ناؤ کو بچا سکوں۔ پہلے میں جیب تراش تھا' محض جیب کترا لیکن اب قاتل بن چکا ہوں۔ دو آدمی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں اور شاید اب تیسرے کا خون بھی میرے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔"

"بشارت۔" سنیتا کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ "یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہاری مرضی کو تو دخل نہیں تھا۔ تم نے ایک شریف اور دیانتدار انسان کی زندگی بسر کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن قدم قدم پر تمہاری راہ میں کانٹے بچھائے

گئے۔ تمہیں مجبور کر دیا گیا کہ تم مجرمانہ زندگی کو اپناؤ اور زندگی بھر دوسروں کے آلہ کار بنے رہو۔ میری کہانی بھی تم سے مختلف تو نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے ساتھ لا کر غلطی نہیں کی تھی۔"

"تمہیں میرا اتنا خیال کیوں ہے؟" بشارت نے اسے گھورا۔

"بس۔ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ خوشیوں میں کھیلتے رہو۔ مسکراتے رہو۔ تمہاری یہ اداسیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔" سنیتا نے کہا۔

"خوشیاں اور مسکراہٹیں۔" بشارت کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "مسرتیں اور مسکراہٹیں تو میرے لئے ایک خواب ہیں سنیتا۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ خوشیاں کیا ہوتی ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ مسکرایا کیسے جاتا ہے۔ میرے ہونٹ تو سدا سے آہوں اور سسکیوں ہی سے آشنا رہے ہیں۔ مسکراہٹیں تو ان کے حصے میں آتی ہیں جو....."

"تمہارے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹیں ابھر سکتی ہیں بشر ملیکہ....." سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی اور اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بشر ملیکہ.....؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بشر ملیکہ تم اپنے ماضی کو فراموش کر دو۔ ان یادوں کو دفن کر دو جو تمہاری زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔" سنیتا نے کہا۔

"اس کے باوجود کہ میرے ہاتھوں دو آدمی مارے گئے ہیں۔ قانون کو میری تلاش ہے اور آج جو کچھ ہوا ہے..... وہ جو کوئی بھی سہی کیا اپنے ایک آدمی کی ہلاکت پر وہ خاموش بیٹھے رہیں گے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں میری بو سونگھتے پھریں گے۔ اس کے باوجود....."

"ہاں۔ اس کے باوجود۔" سنیتا نے کہا۔ "تم نے اب تک ظلم سہے ہیں۔ ہمیشہ دوسروں کے زیر دست رہے ہو لیکن اب تم وہ نہیں رہے۔ تمہارے اندر ایک نیا انسان انگڑائی لے چکا ہے۔ اپنے اندر کے اس آدمی کو جگاؤ اور پھر دیکھو زمانہ کیسے تمہاری ٹھوکروں میں آتا ہے۔ بھول جاؤ کہ تم نے بے بسی اور کسمپرسی کی زندگی گزاری تھی۔"

"ماضی کو درگزر کیا جا سکتا ہے۔ حال کے متعلق تم کچھ نہیں جانتیں اور مستقبل میں کیا ہو گا؟ یہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔" بشارت نے کہا۔

"مستقبل ہمیں خود بنانا ہے۔ ہم بنائیں گے اپنا مستقبل۔" سنینا نے جواب دیا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔" بشارت بولا۔ "ایک قاتل اپنا مستقبل کیسے بنا سکتا ہے؟"

"شاید میں تمہیں اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی۔" سنینا نے کہا۔ "اس وقت میرا ذہن بھی بری طرح الجھا ہوا ہے۔ سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

بشارت کا ذہن بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ نہ وہ سنینا کی کوئی بات سمجھ پا رہا تھا نہ ہی اپنی کوئی بات اسے سمجھا پا رہا تھا۔ اس نے سنینا کی طرف دیکھا اور صوفے سے اتر کر دری پر لیٹ گیا۔ دوسرے صوفے کا ایک کشن اس نے تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

اس کے باوجود کہ آج کے واقعے نے سنینا کو بری طرح خوفزدہ کر دیا تھا وہ صوفے پر لیٹتے ہی سو گئی۔ بشارت البتہ دیر تک جاگتا رہا اور پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

وہ رات کا پچھلا پہر تھا' سائرن کی آوازیں سن کر بشارت کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پولیس سائرن کی آواز تھی۔ لگتا تھا جیسے پولیس کی گاڑی اس عمارت کے سامنے رک گئی ہو۔ اس سے پہلے کہ صورت حال کا کچھ اندازہ لگاتا' سنینا بھی گڑبڑا کر اٹھ گئی۔ سائرن کی آواز بدستور گونج رہی تھی۔ سنینا نے دہشت زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور صوفے سے اچھل کر بشارت کے اوپر آن گری اور اس سے لپٹ گئی۔

سائرن کی آواز بند ہو گئی۔ سڑک پر دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر بھاری قدموں کی یہ آوازیں عمارت کی سیڑھیوں پر سنائی دینے لگیں۔ وہ غالباً کئی پولیس والے تھے جو دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

بشارت کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے پولیس کی وین کو قبرستان کے باہر کھڑی ہوئی جیپ کے قریب رکتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا پولیس نے ان کا سراغ لگا لیا ہے۔

بھاری قدموں کی آوازیں اس کے دماغ میں دھماکے سے پیدا کر رہی تھیں۔ اس

نے سنینا کے دہشت زدہ چہرے کی طرف دیکھا اور پھر باہر والے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ منتظر رہا کسی بھی لمحے دروازہ توڑا جا سکتا تھا۔

☆=======☆=======☆

مسلم ٹاؤن کی عالیشان کوٹھی میں رہنے والا حافظ عبدالرشید دنیا کی نظروں میں نہایت شریف اور باعزت انسان تھا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز مسجد میں جا کر پڑھتا۔ روزے' زکوٰۃ کی سختی سے پابندی کرتا۔ مذہبی تقریبات اور جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ رفاہی اداروں اور انجمنوں کو دل کھول کر چندے دیتا۔ آج تک کوئی سوالی اس کے دروازے سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتا اس کے ہاتھ میں تسبیح ضرور ہوتی۔ وہ جس راہ سے بھی گزرتا لوگ اسے جھک جھک کر سلام کرتے۔ وہ تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل کر چکا تھا اور متعدد افراد کو بھی اپنے خرچ پر حج کروا چکا تھا۔ وہ بہت متقی اور پرہیزگار شخص سمجھا جاتا تھا۔

لیکن حافظ عبدالرشید کی اصلیت کیا تھی؟ وہ تو شاید اس کی رفیقہ حیات بھی نہیں جانتی تھی۔ بظاہر متقی و پرہیزگار' باعزت اور شریف انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے والا حافظ عبدالرشید انسانیت کا سب سے بڑا دشمن اور وہ کیڑا تھا جو معاشرے کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ اسی درخت کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا جس پر اس کا بھی آشیانہ تھا۔

حافظ عبدالرشید ہیروئن کا بیوپاری تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ پینتیس سال پہلے جب وہ دس گیارہ سال کا تھا تو پشاور کے گھٹیا قسم کے قحبہ خانوں میں ڈانس کر کے لوگوں کا دل بہلایا کرتا تھا۔ وہ بہت حسین لڑکا تھا۔ صحت مند اور گول مٹول' جب اسے لڑکیوں کے کپڑے پہنا دیئے جاتے تو اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ پتہ نہیں وہ اس گروہ کے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا جس نے اسے قحبہ خانوں میں نچانا شروع کر دیا اور خوب روپیہ کمایا تھا لیکن اسے وہ وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا۔ اسی دوران میں وہ پشاور کے ایک بدنام زمانہ منشیات فروش کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اسی کے لئے کام کرنے لگا۔ وہ کئی سال تک چرس بیچتا رہا پھر پشاور سے بھاگ کر لاہور آ گیا۔ یہاں وہ ہیرا منڈی میں چراغ پہلوان کے ہاتھ لگ گیا۔ چراغ دین کسی زمانے میں پہلوانی کیا کرتا

تھا لیکن اب اس کے سارے دم خم نکل چکے تھے۔ عورتوں کی دلالی کے علاوہ اس نے منشیات کا دھندہ شروع کر دیا۔ ان دنوں ہیروئن نئی نئی متعارف ہوئی تھی۔ افغانستان پر روس تسلط جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑائی پورے ملک میں پھیلتی جا رہی تھی۔ افغان شہری اپنا ملک چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں پاکستان کا رخ کر رہے تھے اور پاکستانیوں کے لئے اپنے تباہ ہوتے ہوئے ملک سے ہیروئن کا تحفہ بھی یہ لوگ لے کر آئے تھے۔ افغان باشندے سرحدوں پر مہاجر کیمپوں سے نکل کر کینسر کی طرح پورے پاکستان میں پھیلنے لگے اور ان کے ساتھ آئی ہوئی ہیروئن بھی پاکستانی نوجوانوں کے خون میں زہر گھولنے لگی۔

چراغ پہلوان نے بھی ہیروئن کا دھندہ شروع کر دیا۔ ہیروئن چرس کے مقابلے میں اگرچہ مہنگی تھی لیکن بڑا نشہ تھا اس میں۔ بڑا سرور تھا۔ لوگ بڑی تیزی سے اس نئے نشے کو اپنانے لگے۔ اگرچہ بہت جلد اس کی تباہ کاریاں سامنے آنے لگی تھیں لیکن ہیروئن استعمال کرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہیروئن بیچنے والے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنے لگے۔ وہ راتوں رات لکھ پتی اور کروڑ پتی بنتے چلے گئے۔

ایک سال کے اندر اندر چراغ پہلوان نے سمن آباد میں کوٹھی بنوالی۔ عبدالرشید اسی کے پاس کمیشن پر کام کر رہا تھا لیکن اس نے عقلمندی یہ کی کہ چراغ پہلوان کا ساتھ چھوڑ کر اس نے اپنے طور پر یہ دھندا شروع کر دیا۔ وہ اس بزنس کے اسرار و رموز سے واقف ہو چکا تھا۔ ویسے بھی چالاک آدمی تھا۔ بہت جلد آگے نکلتا چلا گیا۔

کسی بھی بزنس میں ذہانت اور چالاکی کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور عبدالرشید کی ذہانت اور چالاکی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ منشیات کا دھندہ کرنے والوں کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہتی تھی لیکن عبدالرشید نے اپنے آپ کو ہمیشہ بچا کر رکھا تھا اور پھر اس نے اپنے آپ کو منظر عام سے بھی ہٹا لیا۔ اس نے وسن پورہ میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ایک شریف انسان کی طرح وہاں رہنے لگا جبکہ اس کے کارندے مصری شاہ' ہیرا منڈی' لکشمی چوک اور ایسے ہی علاقوں میں پھیلے اس کے بزنس کو ترقی دے رہے تھے۔ اس کا کوئی کارندہ کبھی وسن پورے والے مکان پر نہیں آیا تھا۔ وہ علاقے کے رفاہی اور سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا اور پھر اس نے مسجد میں جا کر نماز بھی پڑھنی شروع کر دی تھی۔

عبدالرشید چار سال وسن پورے والے اس مکان میں رہا۔ پھر اس نے سانده میں ایک مکان خرید لیا۔ وہ دو سال اس مکان میں رہا۔ یہاں بھی اس نے اپنی شرافت کی دھاک بٹھالی۔ یہیں پر رہتے ہوئے اس نے پہلا حج کیا تھا۔ اس کا پڑوسی چاچا مال دین بہت غریب آدمی تھا۔ ان کا گزر بیٹے کی تنخواہ پر ہوتا تھا جو کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھا۔ چاچا جمال بڑا متقی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ تنگ دستی کے باوجود اس کی زبان پر کبھی شکوہ نہیں آیا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اسے حج کی سعادت نصیب ہو جائے۔ وہ اکثر اس خواہش کا اظہار بھی کیا کرتا تھا اور پھر اسی سال عبدالرشید' چاچا جمال دین اور اس کی بیوی کو لے کر حج پر چلا گیا۔ چاچا جمال دین اور اس کی بیوی نے اسے جو دعائیں دیں سو دیں' محلے والے بھی اس کار خیر پر عبدالرشید کو دعائیں دے رہے تھے۔

حج کے دوران میں عبدالرشید نے سوچا تھا کہ اب وہ منشیات کا یہ گھناؤنا بزنس چھوڑ دے گا۔ اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ وہ کوئی جائز بزنس کر لے گا۔ دکان کھول لے گا لیکن حج سے واپس آنے کے بعد اس کی نیت پھر ڈانواں ڈول ہو گئی۔ دولت کے سنہرے جال نے اسے پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس جال میں پھنسنے کے بعد کوئی بھی اس سے نجات حاصل کرنا نہیں چاہتا۔

عبدالرشید نے سانده کا وہ مکان چھوڑ کر علامہ اقبال ٹاؤن میں پلاٹ خرید کر کوٹھی بنوالی۔ ان دنوں علامہ اقبال ٹاؤن نیا نیا آباد ہوا تھا۔ عبدالرشید کو سستا پلاٹ مل گیا تھا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس نے یہ کوٹھی بیچ دی اور مسلم ٹاؤن میں ایک بڑی کوٹھی خرید لی جس میں اس نے اپنی مرضی سے کچھ تبدیلیاں بھی کروائی تھیں۔

یہاں رہتے ہوئے اسے کئی سال ہو گئے تھے۔ وہ دو مرتبہ اور حج کر آیا تھا۔ پورے مسلم ٹاؤن میں اس کی شرافت اور دین داری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لوگ اسے حافظ جی کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

حافظ عبدالرشید نہ صرف سماجی اور فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا' ایسے اداروں کو بڑے بڑے چندے دیتا بلکہ اس نے خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے ایک ادارہ بھی کھول رکھا تھا جس کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے برداشت کرتا۔

خواتین کی فلاح و بہبود کا یہ ادارہ وحدت روڈ کی ایک کوٹھی میں قائم تھا۔ یہ کوٹھی

بھی حافظ عبدالرشید ہی کی بلکیت تھی۔ اس ادارے میں خواتین کو بلامعاوضہ سلائی، کڑھائی اور دوسرے ہنر سکھائے جاتے تھے۔ اس کوٹھی کے گیٹ پر دارالامان کا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس کا ایک حصہ بے سہارا خواتین کے لئے مخصوص تھا۔

حافظ عبدالرشید کے چند بااعتماد کارندوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ دارالامان دراصل لڑکیوں کی خرید و فروخت کا اڈہ تھا۔ یہ بزنس حافظ عبدالرشید کے کارندے ہی کرتے تھے۔ اغوا شدہ لڑکیوں کو خرید کر اعلانیہ طور پر یہاں رکھا جاتا تھا۔ ایک طرف ان لڑکیوں کو تسلی دی جاتی کہ انہیں جلد ہی ان کے گھر پہنچا دیا جائے گا اور دوسری طرف یہ تاثر دیا جاتا کہ بے سہارا لڑکیاں ہیں جنہیں حافظ جی نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔

ہر چند روز بعد دارالامان میں رہنے والی کوئی لڑکی یکایک غائب ہو جاتی اور لوگ یہ سنتے کہ حافظ جی نے لڑکی کے ورثا کو تلاش کر کے اسے ان کے حوالے کر دیا ہے۔ حافظ عبدالرشید کی اس دین داری اور خدا ترسی کو بھی محلے والوں نے بہت بڑا رتبہ دے رکھا تھا۔

صرف ایک لڑکی ایسی تھی جو تین سال سے حافظ عبدالرشید کے پاس تھی۔ وہ پہلے دارالامان میں ہی تھی لیکن چند روز بعد حافظ عبدالرشید اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ لڑکی حسن کا شاہکار تھی۔ قدرت نے شاید اسے اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا۔ دراز قامت، صحیح و ملیح چہرہ، ستاروں کی طرح روشن اور چمکتی ہوئی موٹی موٹی آنکھیں۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن حافظ عبدالرشید نے اسے شبانہ کا نام دیا تھا۔ اس لڑکی کے بارے میں لوگ یہ جانتے تھے کہ اس کے ورثا کا ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا اور حافظ جی انہیں بڑی تندہی سے تلاش کر رہے تھے۔

شبانہ کو اس کوٹھی میں رہتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو گھر کا ایک فرد ہی سمجھنے لگی تھی۔ یہاں اس سے اپنوں جیسا سلوک ہی کیا جاتا۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر ہر وقت اداسی اور افسردگی سی چھائی رہتی۔ اس روز حافظ عبدالرشید کا ایک خاص بندہ آیا ہوا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"حافظ جی۔" یامین نام کا وہ آدمی سرگوشیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "سنا ہے دبئی میں ایک لڑکی پکڑی گئی ہے جس نے وہاں کی پولیس کو آپ کے دارالامان کے بارے میں کچھ

بتایا ہے۔"

"اس لڑکی کے پکڑے جانے کا مجھے بھی پتہ چل گیا ہے۔" حافظ عبدالرشید نے کہا۔ "اس نے اگر ہمارے دارالامان کا نام لے دیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ بے سہارا عورتوں کا ادارہ ہے جس کے تمام اخراجات میں برداشت کرتا ہوں۔ میری یہاں ریپوٹیشن ہے۔ اگر دبئی میں پکڑی جانے والی لڑکی نے دارالامان کے خلاف کوئی بیان دیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس کی باتوں پر کون یقین کرے گا۔"

"برا وقت بتا کر نہیں آتا حافظ جی۔" یامین نے کہا۔ "میرا مشورہ ہے کہ دارالامان میں موجود تمام لڑکیوں کو اِدھر اُدھر کر دیں اور اس لڑکی کا بھی کچھ بندوبست کر لیں جو آپ نے گھر میں رکھی ہوئی ہے۔ کیا نام ہے اس کا..... شبانہ..... آپ کے گرگے نوکر مسئلے سے کچھ باتیں سننے میں آئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کسی وقت وہ بھی آپ کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا کر دے گی۔"

"مجھے بھی لگتا ہے کہ وہ کچھ پر پرزے نکالنے لگی ہے۔" حافظ عبدالرشید نے کہا۔ "میں نے دلاور سے بات کر رکھی ہے۔ اسے ابوظہبی سے کسی شیخ کی آمد کا انتظار ہے۔ آج کل میں آنے ہی والا ہے۔"

وہ باتیں کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ حافظ عبدالرشید نے ریسیور اٹھا لیا۔ کچھ دیر بات کرتا رہا پھر فون بند کر دیا اور یامین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "ابھی ہم دلاور کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کا مہمان آ گیا ہے۔ میں نے ان دونوں کو بلایا ہے۔ وہ ایک گھنٹے تک پہنچ جائیں گے۔ تم اب جاؤ۔ میں پھر کسی وقت تم سے بات کروں گا۔"

یامین چلا گیا اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد دلدار اپنے مہمان کو لے کر پہنچ گیا۔ وہ متحدہ عرب امارات کی ایک ریاست عمان کا شیخ تھا۔ تیل کے کنویں تھے۔ دولت بھی تیل کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ اس نے اگرچہ تجری پیس سوٹ پہن رکھا تھا لیکن سر پر سرخ چیک کا رومال اور اس پر نصف ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ حافظ عبدالرشید کی کوٹھی پر بڑے بڑے لوگ آتے رہتے تھے۔ اس لئے اس عرب شیخ کی آمد پر بھی کسی کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے اور پھر حافظ عبدالرشید نے آواز دے کر ملازم لڑکے کو بلالیا۔ "اوئے کاکے۔ چائے کے لئے تو کہہ دو..... اور سنو..... شبانہ سے کہنا چائے وہ لے کر آئے۔"

لڑکا عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

شبانہ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ ملازم لڑکے نے حافظ جی کا حکم سنایا تو شبانہ کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ حافظ جی اکثر اس کے ہاتھ کی چائے پیا کرتے تھے اور آج تو گھر کے دوسرے لوگ بھی کسی دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ شبانہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر ہی میں رہ گئی تھی۔ وہ کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ ملازمہ اپنے کاموں میں لگی رہی۔ چائے بنانے کے بعد شبانہ نے برتن ٹرالی کی ٹرے میں سجائے اور ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم آگئی۔

دلاور کو اس نے اکثر حافظ جی کے پاس آتے دیکھا تھا لیکن اس عرب شیخ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی تھی۔ وہ نظریں جھکائے آگے بڑھتی رہی پھر ٹرالی سے برتن اٹھا کر شیشے کے ٹاپ والی سینٹر ٹیبل پر رکھ کر جیسے ہی واپس جانے کے لئے مڑی' حافظ جی کی آواز سن کر رک گئی۔

"شبانہ بیٹی۔ شیخ راشد ہمارے بہت ہی خاص مہمان ہیں۔ عمان سے آئے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دو۔"

حافظ جی کا یہ حکم شبانہ کے لئے بڑی حیرت کا باعث بنا کیونکہ اس گھر میں پردے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی لیکن آج حافظ جی نے اسے نہ صرف مہمانوں کے سامنے بلالیا تھا بلکہ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر مہمانوں کو پیش کرنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔

چائے بناتے ہوئے شبانہ نے محسوس کیا کہ طوطے کی طرح خمیدہ ناک والا عرب شیخ بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شبانہ نے ایک کپ حافظ جی کے سامنے رکھا' ایک دلاور کے سامنے اور تیسرا کپ عرب شیخ کی طرف بڑھاتے ہوئے شیفون کا دوپٹہ اس کے سینے سے سرک گیا۔ شیخ کی نظریں اسے کانٹوں کی طرح اپنے سینے پر چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ واپس جاتے ہوئے بھی اس نے عرب شیخ کی نظروں کو اپنے بدن پر چبھتے ہوئے

محسوس کیا تھا۔

اس نے ڈرائنگ روم سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ دلاور کی آواز تھی جو اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ "مال تو واقعی زوردار ہے حافظ جی۔ قیامت ہے قیامت....."

شبانہ کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ وہ دبیز پردے کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

"اپنے شیخ سے پوچھو کہ لونڈیا اسے بھی پسند آئی یا نہیں۔" یہ حافظ عبدالرشید کی آواز تھی۔

"ام کو بوت پسند آیا۔" عرب شیخ کی آواز ابھری۔ "بولو..... کیا مانگتا ہے۔ ام بوت رقم لایا....."

"پچیس لاکھ۔" حافظ عبدالرشید نے جواب دیا۔

"بیس لاکھ۔" عرب شیخ نے کہا۔ "رقم لو اور لڑکی کو ابھی ہمارے ساتھ....."

"اس وقت نہیں۔ وہ مشکوک ہو جائے گی۔ صبح سات بجے آجانا۔ میں اسے کسی بہانے تمہارے ساتھ بھیج دوں گا پھر سنبھالنا تمہارا کام ہو گا۔" حافظ جی نے کہا۔

"ام سنبھال لے گا۔" عرب شیخ نے جواب دیا۔

شبانہ کے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیلا جا رہا ہو۔ حافظ عبدالرشید اسے بیٹی کہہ کر بلایا کرتا ہے۔ کیا کوئی باپ اس طرح بیٹی کا سودا کر سکتا ہے..... نہیں' نہیں..... یہ میرا وہم ہے۔ جو کچھ بھی میں نے سنا میری سماعت کا فریب ہے۔ میرا واہمہ ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ شبانہ کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے تاریکی سی پھیلنے لگی اور قریب تھا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھتی اندر سے دلاور کی آواز سنائی دی۔

"اچھا تو حافظ جی۔ ہم چلتے ہیں۔ صبح سات بجے پہنچ جائیں گے۔ لونڈیا کو تیار رکھئے۔"

شبانہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ "تو کیا واقعی ایک باپ نے بیس لاکھ میں اپنی بیٹی کا سودا کر دیا؟" اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی کمرے میں آکر بیڈ پر گر گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ آنکھیں بند کر کے

لمبے لمبے سانس لینے لگی اور پھر اس کے ذہن کے عمیق ترین گوشے سے اس کے ماضی کی دھندلی سی تصویر ابھرنے لگی۔ جو لمحہ بہ لمحہ صاف ہوتی چلی گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے میلے کا وہ منظر گھوم گیا جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ میلے میں ایک دکان پر مٹھائی لینے کے لئے رکی تھی اور اس وقت کسی ناگہانی آفت نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا اور وہ کئی لوگوں کے پاس ہوتی ہوئی آخر کار تین سال پہلے حافظ عبدالرشید کے پاس پہنچ گئی تھی۔ حافظ عبدالرشید نیک اور پرہیز گار آدمی تھا۔ شبانہ نے زندگی میں پہلی مرتبہ سکھ کا سانس لیا تھا۔ وہ جہاں بھی گئی اسے کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ اپنے آپ کو ان انسان نما بھیڑیوں سے بچاتی رہی۔ حافظ عبدالرشید کے گھر میں رہتے ہوئے اسے کسی لمحے بھی ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ حافظ جی نے اسے لاوارث کہہ کر اپنی بیٹی بنا لیا تھا اور اسے بیٹی ہی کی طرح رکھا تھا لیکن آج اس کی اصلیت کھل گئی تھی۔ وہ بظاہر جتنا نیک اور پرہیز گار نظر آتا تھا' اندر سے وہ کہیں زیادہ مکروہ اور گھناؤنا ثابت ہوا تھا۔

"حافظ میرا سودا کر چکا ہے..... صرف اور صرف آج کی رات....." اس نے سوچا اور پھر زیر لب بڑبڑائی۔ "نہیں' نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اسے اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔"

ابھی صرف ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ گھر کے افراد اگرچہ موجود نہیں تھے لیکن نوکر چاکر جاگ رہے تھے۔ وہ وقت گزرنے کا انتظار کرتی رہی۔ لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ بارہ بجے کے قریب گھر والے دعوت سے واپس آگئے۔ کوٹھی میں چہل پہل سی ہو گئی لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اور پھر ساری آوازیں بتدریج معدوم ہوتی چلی گئیں۔

تین بج گئے۔ وہ آہستگی سے پلنگ سے اتری۔ احتیاط سے دروازہ کھولا اور اِدھر اُدھر جھانکتے ہوئے آہٹ لینے کی کوشش کرنے لگی۔ گمبھیر خاموشی اور سناٹا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر دبے قدموں چلتی ہوئی پچھلے لان میں آگئی اور عقبی دیوار کی طرف چلنے لگی۔ اس طرف بھی پچھلی گلی میں کھلنے والا ایک چھوٹا دروازہ تھا جسے اندر سے کنڈا لگا رہتا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے کنڈا ہٹا دیا اور پہلا قدم باہر رکھا ہی تھا کہ اس کا دل اچھل کر حلق میں

آگیا۔ سائیکل سوار چوکیدار سیٹی بجاتا ہوا دائیں طرف کے موڑ سے گلی میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اندر آگئی وہ دروازہ آہستگی سے بھیڑ دیا۔

چوکیدار سامنے سے گزر گیا۔ سیٹی کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ دو منٹ بعد اس نے ایک بار پھر دروازہ کھولا اور گردن نکال کر باہر جھانکنے لگی۔ چوکیدار کی سائیکل اگلے موڑ پر ایک طرف گھومتی ہوئی نظر آئی۔

شبانہ کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ باہر آکر اس نے دروازہ آہستگی سے بھیڑ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ایک طرف چلنے لگی۔ اس کی رفتار میں بتدریج تیزی آرہی تھی اور پھر وہ دوڑنے لگی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا سانس پھول گیا لیکن اس نے اپنی رفتار میں سستی نہیں آنے دی۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے اتنی دور چلی جانا چاہتی تھی کہ حافظ عبدالرشید کے ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکیں۔ نہ جانے وہ کب تک دوڑتی رہی۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہی ہے۔ وہ تو بس دوڑے جا رہی تھی۔

وہ حافظ عبدالرشید کی کوٹھی سے بہت دور آچکی تھی۔ ایک بڑی سڑک پار کر کے وہ ایک اور کشادہ گلی میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی دونوں طرف بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ وہ ایک کوٹھی کے قریب رک گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنے الجھے ہوئے اور بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ وہ اب تک بے تحاشہ دوڑتی رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور پاؤں دکھنے لگے تھے۔ وہ گھر سے ننگے پاؤں نکلی تھی اور اندھا دھند دوڑتے ہوئے پیر زخمی ہو گئے تھے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور زخمی پیر سہلانے لگی۔ اسی وقت دور کہیں کسی چوکیدار کی سیٹی کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی گئی۔

شبانہ نے متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دائیں طرف کے موڑ سے ایک سایہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی لاٹھی سڑک پر بجاتا ہوا گلی میں داخل ہوا۔ شبانہ نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ یہیں بیٹھی رہتی تو چوکیدار کی نظروں میں آسکتی تھی البتہ وہ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی جس سے وہ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ احتیاط سے اٹھی اور دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف جھک گئی۔

وہ جس جگہ کودی تھی وہاں سے کچھ فاصلے پر پودوں کی باڑ نظر آئی۔ وہ باڑ کے دوسری طرف نکل کر گھاس پر بیٹھ گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم گھاس زخمی پیروں سے مس ہوئی تو اسے بڑا سکون سا ملا۔

رات بھر جاگنے اور اس بھاگ دوڑ سے وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ ٹانگوں میں درد اور آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے دیوار کے اندر کودی تھی کہ چوکیدار آگے چلا جائے گا تو وہ یہاں سے نکل جائے گی لیکن تھکن نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ ٹھنڈی اور نرم گھاس پر گرتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چوکیدار کی سیٹی کی آواز بھی یوں لگ رہی تھی جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔ وہ اپنے مختل ہوتے ہوئے حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے اعضا ڈھیلے پڑتے گئے اور کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

گلی سے گزرتی ہوئی کسی کار کے ہارن سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ دھوپ براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور پھر آہٹ پا کر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کوئی اس کے قریب کھڑا تھا۔ کالے چمکتے ہوئے جوتے' ان کے اوپر خاکی پتلون کے پائنچے۔ اس کی نظریں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی گئیں۔ اس کا جسم پسینے میں تر ہونے لگا اور دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔

☆═══☆═══☆

بھاری قدموں کی آوازیں دروازے کے سامنے رک گئیں۔ ایک لمحے کو خاموشی رہی۔ بشارت کا خیال تھا کہ کسی بھی لمحے دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جائے گا۔ اس سے لپٹی ہوئی سنیتا بھی کسی ایسے ہی وقوعے کی منتظر تھی کہ ابھی دروازہ ٹوٹے گا اور پولیس والے رائفلیں تانے اندر گھس آئیں گے لیکن.....

چند سیکنڈ بعد ہی بھاری قدموں کی وہ آوازیں آگے بڑھ گئیں۔ البتہ دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر کسی کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں دم سادھے بیٹھے رہے اور پھر چند لمحوں بعد ہی اسی منزل پر آگے کسی جگہ شور کی آواز سنائی دی۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں اور پھر ایک سنگل فائر۔ اس کے بعد یوں لگا جیسے تین چار آدمی مل کر کسی

آدمی کو پھینٹی لگا رہے ہوں۔ اس آدمی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

سنیتا اور بشارت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس انہیں پکڑنے نہیں آئی تھی بلکہ معاملہ کچھ اور تھا۔ بشارت نے سنیتا کو اپنے سے الگ ہٹایا اور اٹھ کر دبے قدموں چلتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ وہ باہر والے دروازے کے قریب رک گیا اور جھک کر کی ہول سے باہر جھانکنے لگا۔

سیڑھیوں کی نچلی لینڈنگ پر بلب جل رہا تھا جس کی روشنی اوپر بھی آ رہی تھی۔ یہ بلب بعد میں کسی وقت جلایا گیا تھا کیونکہ جب وہ لوگ آئے تھے تو اس وقت اندھیرا تھا۔

کی ہول سے صرف سامنے کا منظر نظر آ رہا تھا۔ سیڑھیوں پر دو پولیس والے رائفلیں سنبھالے کھڑے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور پولیس والا راہداری کی طرف سے آ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے بشارت سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سنیتا اس کے قریب کھڑی تھی۔ بشارت نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ سنیتا نے بھی کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے اسی کمرے میں آ گئے۔ سنیتا کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات تھے۔

"میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔" بشارت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "لیکن تم تو پولیس کا سائرن سن کر ہی حواس کھو بیٹھی تھیں۔ اگر پولیس اندر آ جاتی تو شاید تمہارا ہارٹ فیل ہو جاتا۔"

"میں بزدل نہیں ہوں۔" سنیتا نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ "میں نیند میں تھی۔ سائرن کی آواز سن کر گڑبڑا گئی لیکن یہ پولیس والے ہمارے دروازے کے سامنے کیوں کھڑے ہیں۔"

"اس بلڈنگ میں کن کن لوگوں کے دفتر ہیں۔ میرا مطلب ہے وکیلوں کے علاوہ؟" بشارت نے پوچھا۔

"زیادہ تر وکیلوں ہی کے ہیں۔ ہائی کورٹ یہاں سے قریب ہے نا۔" سنیتا نے جواب

دیا۔ "ویسے دو یا تین دفتر امپورٹ ایکسپورٹ کمپنیوں کے بھی ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ پولیس نے چھاپہ کہاں مارا ہے۔"

"میرا خیال ہے اس وکیل کے دفتر پر جس کے بارے میں چوکیدار نے بتایا تھا کہ وہ بیٹھا کسی کیس کی اسٹڈی کر رہا ہے۔ ٹھیک صورت حال کا علم تو صبح ہو گا۔ چوکیدار سے۔" بشارت نے جواب دیا۔ "ویسے اگر پولیس یہاں چھاپہ مارتی تو ہمارے فرار کا کوئی راستہ تھا؟"

"وہ کھڑکی۔" سنیتا نے اشارہ کیا۔ "پولیس کی گولیوں سے بچنے کے لئے اس کھڑکی سے ہی چھلانگ لگا کر زندگی سے فرار حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

بشارت اسے گھور کر رہ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک بار پھر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ بشارت' سنیتا کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچ گیا اور جھک کر کی ہول سے جھانکنے لگا۔ پہلے تین پولیس والے دروازے سے گزر کر سیڑھیاں اترنے لگے۔ ان کے پیچھے لمبے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا جس نے سفید دھوتی اور کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ پر سے دھوتی خون آلود تھی اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ دائیں بائیں دو پولیس والوں نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ ایک پولیس والے نے پیچھے سے رائفل کی نال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ آخر میں ایک انسپکٹر' وکیل اور عمارت کا چوکیدار تھا۔ وکیل کو بشارت نے اس کے سیاہ کوٹ سے پہچانا تھا۔ بشارت وہاں سے ہٹ کر سنیتا کے پاس آگیا۔

"میرا اندازہ درست نکلا۔" بشارت نے سرگوشی میں سنیتا کو بتایا۔ "چھاپہ وکیل کے دفتر پر ہی پڑا تھا۔ وہاں ایک اور آدمی بھی موجود تھا جسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ وہ زخمی تھا۔ اس نے شاید بھاگنے کی کوشش کی ہو گی۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔"

"کون ہو سکتا ہے؟" سنیتا بڑبڑائی۔

"یہ تو صبح ہی پتہ چلے گا۔" بشارت نے کہا۔

نیچے سڑک پر کم از کم دو گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ سنیتا اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آگئی اور جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔ سڑک اب سنسان پڑی تھی۔

دوبارہ نیند آنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بشارت نے آفس ٹیبل کے سامنے شیشے کی الماریوں کے اوپر دیوار پر لگے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔

سپیدہ نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر انہی غنڈوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے جنہوں نے ان کا تعاقب کیا تھا اور ایک اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

"میں نے پہلی مرتبہ جب انہیں دیکھا تھا تو مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا۔" بشارت کہہ رہا تھا۔ "ان میں سے ایک کو دیکھ کر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن ابھی تک کچھ یاد نہیں آرہا۔"

"کون سا..... جو مارا گیا یا جو بھاگ گیا؟" سنیتا نے پوچھا۔

"اب بھی یاد نہیں کہ ان میں مارا کون گیا ہے اور بھاگا کون تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "لیکن اگر زندہ بچ جانے والا وہی ہے جس کا چہرہ مجھے جانا پہچانا لگا تھا تو مجھے یقین ہے کہ بہت جلد اس سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔"

"مجھے ایک اور خیال آرہا ہے۔" سنیتا نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ شبنم کے آدمی نہ ہوں۔ وہ کوئی اور ہوں اور مجھے..... میرا مطلب ہے ہمیں دیکھ کر ان کی نیت میں فتور آگیا ہو۔ آج کل یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ انہوں نے سوچا ہو گا کہ تمہیں کہیں مار پیٹ کر ڈال دیں گے اور مجھے ساتھ لے جائیں گے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔" بشارت نے جواب دیا۔

دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دھوپ نکلنے والی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ سنیتا نے اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سامنے والی عمارتوں کے نیچے اکا دکا دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ سنیتا کھڑکی سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور باہر کا دروازہ کھول کر چوکیدار کو آوازیں دینے لگی۔ چوکیدار اس وقت عمارت کی پہلی منزل پر تھا۔ آواز سن کر دو منٹ میں اوپر آگیا۔

"چوکیدار۔ دیکھو قریب ہی کوئی ہوٹل کھل گیا ہو تو ہمیں چائے لا دو اور کچھ کھانے کو بھی لے آنا۔ جو بھی مل جائے۔" سنیتا نے کہا۔

"جی بیگم صاحب۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ پر وہ رات والی چینک۔" چوکیدار

بولا۔

سنینا نے اندر آکر اپنے پرس میں سے پچاس کا نوٹ نکالا اور چیک اور پیالیاں بھی اٹھا کر چوکیدار کو دے دیں۔ چوکیدار جانے لگا تو سنینا بولی۔ "اور ہاں..... رات کو یہاں کیا ہوا تھا؟"

"وہ جی وکیل صاحب ہیں نا۔ رات کو ان کے پاس ایک بندہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ قصور کا زمیں دار ہے۔ اس کے ہاتھوں کوئی بندہ مارا گیا تھا جی وہ گرفتاری سے پہلے ضمانت کرانا چاہتا تھا ہائی کورٹ سے۔ وکیل صاحب رات کو اس کا کام کر رہے تھے۔ پولیس کو کسی طرح پتہ چل گیا۔"

"اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی؟" سنینا نے پوچھا۔

"آہو جی۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ "وہ پولیس کے سائرن کی آواز سن کر چھت پر چڑھ گیا تھا۔ تھانے دار نے اسے دیکھ کر گولی چلا دی۔ اگر اسے گولی نہ لگتی تو وہ چھت کے دوسری طرف چھلانگ لگا دیتا اور نیچے گر کر ہڈیاں پسلیاں تڑوا بیٹھتا۔"

"جان بڑی پیاری ہوتی ہے چوکیدار۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے ہی بھاگا ہو گا۔ خیر..... تم جاؤ۔ چائے لے کر آؤ۔" سنینا نے کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

بشارت اس دوران میں اپنی جگہ پر بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد چوکیدار چائے اور دو بیٹھے بن کر لے آیا۔ بشارت نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا تھا جبکہ سنینا دونوں بن کھا گئی۔ اسے واقعی بہت بھوک لگ رہی تھی۔

ساڑھے سات بجے کے بعد اس عمارت میں واقع دفاتر کھلنا شروع ہو گئے اور آٹھ بجے تو اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی۔ لوگوں کی آمد و رفت اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

سنینا نے دوسرے کمرے میں جا کر دو کارٹن کھولے اور ان میں سے رینگلر کی ایک جینز کی پینٹ اور نیلے چیک کی شرٹ نکال لائی۔

"یہ کپڑے کہاں سے آئے؟" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"باہر کا مال ہے۔ کارٹن بھرے پڑے ہیں اور میرا خیال ہے یہ تمہارے جسم پر فٹ آئیں گے۔ ظاہر ہے تم وہ خون آلود قمیض پہن کر تو باہر نہیں نکل سکتے اور تمہاری اس پینٹ پر بھی کچھ چھینٹے نظر آ رہے ہیں۔"

بشارت کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ رات کے واقعات اور پھر جاگنے کی وجہ سے اس کا دماغ سلگ رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے اس کی کسلمندی کسی حد تک دور ہو گئی۔ وہ کپڑے بدل کر باہر نکلا تو اسے دیکھ کر سنینا کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ آ گئی۔ یہ کپڑے بشارت کے جسم پر بالکل فٹ آئے تھے۔

سنینا بھی تیار ہو گئی۔ اس نے خراشوں پر ایک بار پھر لوشن لگا لیا تھا۔ اس کی قمیض ایک کندھے سے پھٹی ہوئی تھی جہاں اس نے میز کی دراز سے ایک چھوٹا بکل نکال کر لگا لیا۔

دفتر سے نکل کر شاہراہ قائداعظم پار کر کے ہال روڈ اور میو اسپتال کے سامنے اسپتال روڈ سے ہوتے ہوئے لوہاری کے سامنے نکل آئے اور پھر بھاٹی گیٹ اور داتا دربار کے سامنے سے گزرتے ہوئے نکسلی گیٹ کی طرف آ گئے۔

یہ لوگ نو بجے کے قریب دفتر سے نکلے تھے اور اس وقت پونے دس کا وقت ہو رہا تھا۔ بی بی گھر میں موجود تھی۔

"بی بی ناشتہ بناؤ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" سنینا کہتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئی۔

بشارت ہال میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ آدھے گھنٹے بعد سنینا تیار ہو کر نکلی تو بی بی بھی ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ میز پر بیٹھنے سے پہلے سنینا نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر دیکھا۔ ٹون آ رہی تھی۔

"بی بی کسی کا فون تو نہیں آیا تھا؟" اس نے ریسور رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اے ہاں..... میں تو بتانا بھول گئی بیٹی۔" بی بی نے پلیٹیں میز پر لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "کوئی عورت تھی۔ اس نے اپنا نام تو نہیں بتایا۔ کہتی تھی پھر فون کر لے گی۔"

"عورت؟" سنینا بڑبڑائی۔ اس کے جاننے والوں میں ظاہر ہے خواتین بھی تھیں

لیکن اس وقت صرف ایک نام اس کے ذہن میں آسکا تھا۔ شبنم..... سنینا کا شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ رات کو اسی کے آدمیوں نے اسے گھیرنے کی کوشش کی تھی اور پھر آدھے گھنٹے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

ناشتے کے بعد وہ بشارت کے سامنے بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر ریسیور اٹھالیا۔

"سنینا۔" اس کی ہیلو کے جواب میں نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ شبنم ہی تھی۔ "سنا ہے تم نے ایک کتا پال رکھا ہے اور تمہارے پر پرزے نکل آئے ہیں۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "گزشتہ رات تم لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں' میں اپنے آپ کو تمہارے کتے کے حوالے کر دیتی۔" سنینا نے جواب دیا۔ "میں نے تمہیں کئی مرتبہ کہا ہے مجھے بھول جاؤ شبنم لیکن اب اندازہ ہوا کہ تم جیسی بے غیرت عورتیں آسانی سے کوئی بات نہیں مانتیں' اور اب تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو انجام اس سے بھی برا ہو گا۔"

"مجھے دھمکی دے رہی ہو۔" شبنم کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "میرا ایک بندہ مار دیا اور مجھے کہتی ہو میں خاموش بیٹھی رہوں۔ سنو سنینا۔ اگر میں چاہتی تو رات ہی کو تمہارے دفتر پر چھاپہ لگوا کر تم دونوں کو اندر کروا دیتی لیکن..... یہ میرا معاملہ ہے اور اس کا حساب بھی تم سے میں ہی لوں گی۔"

سنینا اچھل پڑی۔ شبنم کو کیسے پتہ چلا کہ وہ دونوں رات کو دفتر میں تھے۔

"تمہارے بندے کو ہم نے نہیں مارا شبنم۔" اس نے کہا۔ "وہ اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مرا ہے۔ اور رہی حساب کی بات تو اب میں تم سے ضرور حساب کروں گی۔" اس نے دوسری طرف سے جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔

"یہ شبنم تھی۔ کیا کہہ رہی تھی؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ویسے سنینا کی باتوں سے وہ سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف سے کیا کہا ہو گا۔

"پہلی چوٹ لگی ہے۔ زخمی کتیا کی طرح بلبلا رہی تھی۔" سنینا نے جواب دیا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو سنینا شبنم سے اس لہجے میں بات نہ کرتی لیکن اب بشارت اس کے ساتھ موجود تھا اور گزشتہ رات بشارت کی آزمائش بھی ہو گئی تھی۔ اب وہ شبنم سے دبنے

کو تیار نہیں تھی۔

"تو گویا کھیل شروع ہو گیا ہے۔" بشارت نے کہا۔

"اسے یہ بھی پتہ ہے کہ رات کو ہم دفتر میں تھے۔" سنینا نے کہا۔

"اوہ۔" بشارت اس بات پر چونک گیا۔ "گویا وہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔ تمہارا یہ گھر بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہمیں کسی اور جگہ کا بھی بندوبست کرنا پڑے گا جہاں ضرورت کے وقت ہم پناہ لے سکیں۔ بلکہ اس کا بندوبست تو آج ہی کرنا ہو گا۔"

وہ دیر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اکیلا ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بڑی رقم بھی جیب میں رکھ لی تھی۔ سنینا کے ذمے اس نے ایک اور ڈیوٹی لگا دی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سنینا بھی گھر سے نکل گئی تھی۔

بشارت کبھی رکشا اور کبھی ٹیکسیوں پر شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتا رہا اور آخر کار ایک پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے علامہ اقبال ٹاؤن کے چناب بلاک میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی۔ کوٹھی دس مرلے پر تھی اور کرایہ اگرچہ زیادہ تھا لیکن اس کے آس پاس زیادہ کوٹھیاں زیر تعمیر تھیں یا پلاٹوں پر بنیادوں تک کام کر کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ قریب ترین آباد مکان بھی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھے۔ بشارت نے یہ کوٹھی اس لئے لے لی تھی کہ پڑوسیوں کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

جب وہ واپس لوٹا تو شام کے سات بج چکے تھے۔ سنینا اس سے پہلے ہی آچکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کرنے لگے۔

"پولیس نے آج شکرے کا بیان لے لیا ہے۔" سنینا بتا رہی تھی۔ "اس نے تمہارے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ جب وہ زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا تھا تو نیم بے ہوشی میں تمہارا نام بڑبڑا رہا تھا جس کے بارے میں اس نے پولیس کو بتایا کہ اس کے بڑے بھائی کا نام ہے جو سیالکوٹ میں کہیں رہائش پذیر ہے۔"

"کیا پولیس اس کے بیان پر یقین کر لے گی۔" بشارت بولا۔

"اس نے تو اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے۔ کہ وہ اس دوسرے شخص کو بھی نہیں جانتا جس نے مداخلت کی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بھی کوئی رہزن ہو جو چوہدری عمر کے مینیجر

کے پیچھے لگا ہوا تھا اور آخر کار رقم کا بیگ لے کر بھاگ گیا۔" سنیتا نے بتایا۔

"پولیس اس کے بیان پر کبھی یقین نہیں کرے گی۔" بشارت نے پھر کہا۔

"شکرے کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔ پولیس اس کا ریمانڈ لینا چاہتی ہے لیکن ریمانڈ اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ بالکل تندرست نہ ہو جائے۔ ویسے اسے آج شام وارڈ سے نکال کر ایک کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے جہاں ایک مریض اور بھی ہے۔ وہ بھی قیدی ہے۔ اسپتال کے جیل وارڈ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ بندوبست کیا گیا ہے کیونکہ اسے جنرل وارڈ میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔"

"گڈ!" بشارت کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا تھا لیکن فی الحال اس کے بارے میں سنیتا کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ اسے اقبال ٹاؤن والی کوٹھی کے بارے میں بتانے لگا۔ "کل دن میں وہاں کچھ ضروری فرنیچر اور ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچا دوں گا اور تمہیں کل کا دن گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں۔ میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے۔ تفصیل بعد میں کسی وقت بتاؤں گا لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس موقع پر شبنم کی وجہ سے کوئی الجھن پیدا ہو جائے۔"

اگلے دن بشارت نے تمام ضروری سامان اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں پہنچا دیا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وہ کھلے دل سے خرچ کر رہا تھا۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس نے سنیتا کو ابھی تک وہ کوٹھی نہیں دکھائی تھی اور اس روز سنیتا سے وہ خبر سن کر بشارت چونک گیا۔

"کل اسپتال کے جیل وارڈ سے ایک قیدی کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس کا بیڈ خالی ہو جائے گا اور شکرے کو وہاں منتقل کر دیا جائے گا۔"

"ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔" بشارت نے کہا۔ "اگر شکرا جیل وارڈ میں منتقل ہو گیا تو ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" سنیتا نے اسے گھورا۔

"شکرے کو پولیس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔" بشارت نے کہا۔ "پولیس عدالت میں بھی اس کے خلاف دہرے قتل کا الزام ثابت کر دے گی۔ اسے یا تو موت کی سزا ہو گی یا وہ زندگی بھر جیل میں سڑتا رہے گا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

"کیا کر لو گے تم؟" سنیتا بولی۔

"جو کچھ کرنا ہے۔ آج ہی رات کرنا ہے۔" بشارت نے کہا اور پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" سنیتا نے اسے گھورا۔ "دو مسلح پولیس والے چوبیس گھنٹے وہاں موجود رہتے ہیں۔ تم خود بھی مرنا چاہتے ہو کیا؟"

"رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ میں شکرے کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔" بشارت نے جواب دیا اور پھر دونوں دیر تک اس موضوع پر بحث کرتے رہے۔

اسی رات گیارہ بجے کے قریب ایک نرس اور ڈاکٹر اسپتال کی اس راہداری میں داخل ہوئے جس کے دونوں طرف پرائیویٹ رومز تھے۔ نرس بہت خوبصورت تھی۔ اس نے ہاتھ میں کڈنی شیپ کی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں سرنج انجکشن اور ڈسٹل واٹر کے ایمپیول اور تھرمامیٹر وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا جس پر کئی کاغذ لگے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر وہ کاغذ تھا جس پر چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ یہ مریض کی ٹمپریچر شیٹ تھی اور بال پین کی آڑی ترچھی لائنیں ٹمپریچر ظاہر کر رہی تھیں۔

راہداری کے آخر میں دائیں طرف والے کمرے کے سامنے اسٹول پر ایک پولیس کانسٹیبل بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ رائفل اس نے قریب ہی دیوار سے ٹکا رکھی تھی۔ نرس اور ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر وہ اٹھ گیا اور رائفل بھی اٹھا لی۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسپتال میں سگریٹ پینا منع ہے۔" ڈاکٹر نے کانسٹیبل کو گھورتے ہوئے کہا۔

"معاف کرنا ڈاکٹر جی۔ نیند آرہی تھی۔" کانسٹیبل نے کہتے ہوئے سگریٹ فرش پر پھینک کر پیر سے مسل دیا۔ "پھر آپ اس وقت....."

"مریض کو چیک کرنا ہے۔ جسے صبح جیل وارڈ میں منتقل کیا جائے گا۔ شام تک کی رپورٹ کے مطابق اسے بخار ایک سو دو سے اوپر تھا۔" ڈاکٹر نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کلپ بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن شام کو تو دوسرا ڈاکٹر آیا تھا اور سسٹر بھی دوسری تھی۔" کانسٹیبل نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"آج تیس تاریخ ہے۔ مہینے کا آخری دن۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور ہر مہینے کی آخری تاریخ کو نرسوں اور ڈاکٹروں کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے۔ دروازہ کھولو۔"

کانسٹیبل نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کانسٹیبل باہر ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ اندر داخل ہو کر نرس نے دروازہ بھیڑ دیا اور ہاتھ پیچھے کر کے بڑی آہستگی سے بولٹ بھی لگا دیا۔

کمرے کے اندر بھی ایک کانسٹیبل موجود تھا۔ وہ ایک دیوار کے ساتھ کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ فرش پر پھینک کر پیر سے مسل دیا اور رائفل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ دو بیڈ تھے۔ بائیں طرف والے بیڈ پر ایک ادھیڑ عمر مریض سو رہا تھا۔ دوسرے بیڈ پر شکرا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

ایک طرف باتھ روم کا دروازہ تھا اور اس کے قریب ہی ایک وہیل چیئر پڑی ہوئی تھی۔ کمرے کے عقبی سمت میں کھڑکی تھی جس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر شکرے کے بیڈ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کلپ بورڈ اس نے بیڈ پر رکھ دیا اور کندھے پر لٹکا ہوا اسٹیتھسکوپ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"کیسے ہو اب؟" وہ شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" شکرے نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "مگر یہ اسپتال ہے یا قحبہ خانہ۔ مریضوں کو آرام بھی نہیں کرنے دیا جاتا۔ جس ویلے دیکھو نرس یا ڈاکٹر منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔"

"مریضوں کے آرام کی خاطر ہمیں بھی راتوں کو جاگنا پڑتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا اور نرس کو اشارہ کیا۔

نرس نے آگے بڑھ کر تھرما میٹر شکرے کے منہ میں ٹھونس دیا اور کلائی پکڑ کر انگلیاں نبض پر رکھ دیں۔ ڈاکٹر کانسٹیبل سے باتیں کرنے لگا۔

"یہ دوسرا مریض بہت گہری نیند سو رہا ہے۔" اس نے دوسرے مریض کی طرف اشارہ کیا۔

"بہت کھپ مچاتا ہے جی یہ....." کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"شام کو جو سسٹر انہیں دیکھنے آئی تھی اس نے مجھے ایک گولی دے دی تھی کہ رات کو کھپ مچائے تو میں گولی اسے کھلا دوں۔ آدھا گھنٹہ پہلے میں نے گولی اسے کھلا دی تھی۔ سویرے تک سویا رہے گا۔"

کانسٹیبل نے بات کرتے ہوئے رائفل کرسی پر رکھ دی تھی۔ ڈاکٹر نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی اچھل کر اسے دبوچ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کانسٹیبل کا منہ دبا لیا تھا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ کانسٹیبل بری طرح مچلنے لگا لیکن ڈاکٹر کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اسے باتھ روم کے دروازے کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ نرس نے جلدی سے آگے بڑھ کر باتھ روم کا دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر کانسٹیبل کو گھسیٹتا ہوا باتھ روم میں لے گیا۔

شکرے کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے تھرما میٹر منہ سے نکال دیا وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر نرس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دو منٹ بعد ڈاکٹر باتھ روم سے باہر آگیا۔ اس نے نرس کو اشارہ کیا۔ نرس دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"کک..... کون ہو تم..... یہ کیا کر رہے ہو؟" شکرے کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں شکرے۔" ڈاکٹر نے سرگوشی کی۔ "میں بشارت ہوں۔ ہم تمہیں یہاں سے لے جانے کا بندوبست کر رہے ہیں۔"

"بشارت۔" شکرا چونک گیا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر کی داڑھی اور نیلی آنکھوں کو گھورنے لگا۔

نرس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ڈاکٹر کا اشارہ پا کر بڑی آہستگی سے بولٹ ہٹایا پھر دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر اس دوران میں دروازے کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔

"کانسٹیبل۔ اندر آؤ۔ ذرا جلدی۔" نرس نے باہر کھڑے ہوئے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔

کانسٹیبل جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا' دروازے

کے پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکٹر کا گھونسہ اس کی کھوپڑی پڑا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ لڑکھڑاتا گیا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل بھی نیچے گر گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اسے چھاپ لیا۔ وہ اسے فرش پر گرا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی کنپٹیاں مسلنے لگا۔ ایک منٹ کے اندر اندر کانسٹیبل ڈھیر ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اسے بھی گھسیٹ کر باتھ روم میں ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ نرس کمرے کا دروازہ بند کر کے بولٹ لگا چکی تھی۔

"وہیل چیئر لے کر آؤ سنیتا۔" ڈاکٹر نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جلدی سے شکرے کے بیڈ کے قریب پہنچ گیا جو اب بھی الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "تم وہیل چیئر پر تو بیٹھ سکتے ہو نا؟" ڈاکٹر نے کہا اور شکرے کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

اور پھر ٹھیک اسی لمحے آہٹ سن کر ڈاکٹر نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کا ہینڈل گھوما تھا۔ اندر سے بولٹ لگا ہوا ہونے کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ ہینڈل کو زور زور سے حرکت ہونے لگی۔

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے سنیتا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ بشارت نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔

باہر سے دروازہ اب دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔

☆=====☆=====

سنیتا اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھ وہیل چیئر پر اس طرح جم گئے جیسے چپک کر رہ گئے ہوں۔

بشارت کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس نے شکرے کو دوبارہ لٹا دیا۔ کرسی پر پڑی ہوئی کانسٹیبل کی رائفل اٹھائی اور بڑی تیزی سے حرکت کرتا ہوا دروازے کے قریب دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رائفل کی نال اوپر کی طرف کر کے دونوں ہاتھوں میں اس طرح پکڑ لیا کہ کسی بھی لمحے اسے استعمال کر سکتا تھا۔ اسی لمحے دروازہ ایک مرتبہ پھر دھڑ دھڑایا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"اندر کون ہے؟ دروازہ کھولو۔"

بشارت نے میر کی حرکت سے سنیتا کو اشارہ کیا۔ سنیتا کی آنکھوں میں وحشت تھی اور چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی اور بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولٹ ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا' اگر وہ اچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتی تو دروازہ اس کے منہ پر لگتا۔

وہ ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا' اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے پہلے بیڈ پر پڑے ہوئے شکرے کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں سنیتا کے چہرے پر جم گئیں۔

"دروازہ کیوں بند کر رکھا تھا سسٹر اور وہ دونوں کانسٹیبل کہاں گئے؟" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔

"وہ..... وہ میں اکیلی تھی نا' اس لئے میں نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا تھا۔" سنیتا نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اور وہ دونوں سنتری اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر کہاں دفع ہو گئے ہیں۔" ہیڈ کانسٹیبل بولا۔

"وہ دونوں چائے پینے باہر ہوٹل چلے گئے ہیں۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "میں مریض کا

ٹمپریچر لینے آئی تھی۔ انہوں نے کہا میں تھوڑی دیر کے لئے یہاں رک جاؤں۔ وہ چائے پی کر آ گئے ہیں۔"

"کیا بات ہے سسٹر..... نہیں..... نرس جی۔" ہیڈ کانسٹیبل کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ "وہ چائے پینے گئے ہیں یا تم نے انہیں رشوت دے کر تھوڑی دیر کے لئے یہاں سے ہٹا دیا ہے۔ پتہ نہیں اس کتے کے پلے میں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ جو بھی نرس آتی ہے اس پر ریجھ جاتی ہے۔" اس نے بستر پڑے ہوئے شکرے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں جیل وارڈ کا انچارج ہوں اور ان دونوں سنتریوں کو پتہ ہے کہ اس وقت ان کے لئے چائے لے کر آتا ہوں۔ بڑے بے وقوف تھے وہ جو اس خطرناک قیدی کو اکیلے چھوڑ کر چلے گئے۔ لگتا ہے تم نے انہیں کوئی ایسی ہی رشوت دی ہو گی یا کوئی وعدہ کیا ہو گا۔ ویسے یہ قیدی زخمی ہے، بھاگ تو نہیں سکتا۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو حوالدار۔" سنیتا جلدی سے بولی۔ "میں..... میں تو اس کا ٹمپریچر لینے آئی تھی اور کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے ایک قیدی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"آدھی رات کو قیدی کا ٹمپریچر۔ او سوہنیو! ہمارا ٹمپریچر بھی تو لے کر دیکھو نا۔ قیدی میں نہ سہی، مجھ میں دلچسپی لے کر دیکھو..... ٹھہرو میں دروازہ بند کر دوں کہیں وہ کھوتے واپس آ کر رنگ میں بھنگ نہ ڈال دیں۔"

ہیڈ کانسٹیبل گھوم گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ دروازہ بند تھا اور دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے بشارت کی رائفل اس کی طرف تنی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے سوہنیو!" بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "یہ نرس اصل میں نئی نئی آئی تھی۔ اسے پولیس والوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تمہارا ٹمپریچر تو میں لوں گا۔"

"کک..... کون ہو تم لوگ؟" ہیڈ کانسٹیبل کے چہرے پر دہشت سی ابھر آئی۔

"سمجھ گیا۔ ساری بات سمجھ گیا۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو اور نہ ہی یہ نرس ہے۔ تم لوگ اس قیدی کو..... ....."

"... گئے ہو تو اپنی چونچ بند رکھو۔" بشارت نے غراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو اس رائفل کے میگزین میں بھری ہوئی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ پیچھے رکھو۔"

"کیوں اپنی جان کے ویری ہو رہے ہو تم لوگ۔" ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ "تم لوگ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے۔"

"یہ ہمارا درد سر ہے کہ ہم اپنے ارادے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔" بشارت نے کہا۔ "میں نے جو کہا ہے وہ کرو ورنہ....." اس نے رائفل کو حرکت دی۔

ہیڈ کانسٹیبل دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ پشت پر رکھ لئے۔ وہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ ہو سکتا ہے جوانی میں کبھی بہادری کے کوئی کارنامے انجام دیئے ہوں لیکن اس وقت رائفل کی نال اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھ کر وہ ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے قبل از وقت زندگی سے ریٹائر ہونا پڑے۔ ویسے اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں اپنے ایک ساتھی کی رائفل دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں سنتری کہاں گئے ہوں گے۔

بشارت نے سنیتا کو اشارہ کیا۔ سنیتا نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوسرے مریض کے بیڈ پر سرہانے کی طرف نیلا چک دار بڑا سا رومال پڑا ہوا تھا۔ اس نے لپک کر وہ رومال اٹھا لیا اور حوالدار کے ہاتھ پشت پر بڑی سختی سے باندھ دیئے۔ بشارت کے بیڈ کے قریب چھوٹی سی میز پر ڈوری کے علاوہ کاٹن کا ایک رومال بھی پڑا ہوا تھا اس نے وہ بھی اٹھا لیا۔

"اب گھوم کر کھڑے ہو جاؤ۔" بشارت نے حوالدار کو حکم دیا۔

"تم لوگ بہت برا کر رہے ہو۔" ہیڈ کانسٹیبل نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور سنیتا نے وہ حرکت کی جس کی توقع نہ بشارت کو تھی اور نہ ہی ہیڈ کانسٹیبل کو۔ اس نے آگے بڑھ کر ہیڈ کانسٹیبل کے گال پر ہونٹ جما دیئے اور اس کے ساتھ ہی کاٹن کے رومال میں سے مٹھی بھر روئی توڑ کر اس کے منہ میں ٹھونس دی اور ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ حوالدار کے گال پر سرخی سے اس کے ہونٹوں کا نشان بن گیا تھا۔

"پھر مت کہنا میں نے تمہارا ٹمپریچر نہیں دیکھا تھا۔" سنیتا نے کہا۔ "تمہارا ٹمپریچر ڈاؤن ہو چکا ہے۔ تم ٹھنڈے ہو چکے ہو۔"

بیڈ پر پڑے ہوئے شکرے کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ بشارت ہیڈ کانسٹیبل کو دھکیلتا ہوا باتھ روم کی طرف لے گیا۔ اس نے جھک کر دروازہ کھولا اور ہیڈ

کانسٹیبل کو اندر دھکا دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کندھے پر رائفل کا بٹ بھی رسید کر دیا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل ہاتھ روم کے فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے سنتریوں پر گرا۔ بشارت نے جلدی سے دروازہ بند کر کے بولٹ کھینچ دیا۔

"سنیتا وہیل چیئر لاؤ' جلدی کرو۔" وہ بیڈ کی طرف لپکا۔ "اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت نازل ہو جائے' ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔"

اس نے رائفل بیڈ پر رکھ دی اور بشارت کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ سنیتا وہیل چیئر دھکیلتی بیڈ کے قریب لے آئی۔ ان دونوں نے شکرے کو سہارا دے کر وہیل چیئر پر اس طرح بٹھایا کہ اس کی زخمی پشت وہیل چیئر کی پشت سے نہ لگے۔ بشارت نے بیڈ پر پڑی ہوئی رائفل اور دروازے کے پیچھے پڑی ہوئی دوسرے کانسٹیبل کی رائفل بھی اٹھا کر شکرے کی ٹانگوں کے ساتھ پائیدان پر کھڑی کر دیں اور چادر اٹھا کر شکرے کے اوپر اس طرح ڈال دی کہ نہ صرف دونوں رائفلیں بلکہ اس کا پورا جسم بھی چھپ گیا۔ بشارت نے اس کا چہرہ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

بشارت نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ اس نے سنیتا کو اشارہ کر دیا۔ وہ وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی باہر لے آئی۔ باہر دروازے کے قریب ہی لکڑی کے اسٹول پر چائے کی کیتلی اور پلاسٹک کے مگ رکھے ہوئے تھے۔ یہ چائے جیل وارڈ کا انچارج ہیڈ کانسٹیبل ان سنتریوں کے لئے لے کر آیا تھا جو اب اس کے ساتھ غسل خانے میں بے ہوش پڑے تھے۔

اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ اسپتال کی تمام راہداریاں سنسان پڑی تھیں۔ ڈاکٹرز اور نرسیں بھی اپنے اپنے ڈیوٹی رومز میں سو رہے ہوں گے۔

ربر سول کے جوتوں کی وجہ سے ان کے قدموں کی ہلکی سی آواز بھی نہیں ابھر رہی تھی۔ وہ کسی دشواری کے بغیر راہداریوں سے نکل کر کشادہ برآمدے میں آ گئے۔ برآمدے کی سیڑھیوں کے ساتھ ہی ریمپ بھی بنا ہوا تھا۔ اس ریمپ پر پہنچ کر بشارت نے بھی ایک ہاتھ سے وہیل چیئر سنبھال لی تاکہ وہ ڈھلان پر لڑھک نہ جائے۔ برآمدے میں ایک طرف کرسی پر بیٹھے ہوئے نائٹ ڈیوٹی والے چوکیدار نے ابھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ اگر کوئی عام آدمی کسی مریض کو آدھی رات کے وقت باہر لے جانے کی کوشش کرتا تو وہ اسے ضرور

روکتا۔ مگر ایک نرس اور ڈاکٹر کو روکنے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔

وہ کرسی کو دھکیلتے ہوئے اسپتال کے بیرونی گیٹ کی طرف آ گئے۔ بڑا گیٹ بند تھا البتہ ذیلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہاں بھی اسٹول پر ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس نے بھی الجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"مریضوں کو تھوڑی سی تفریح کرا دینا بھی ان کی صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔" بشارت نے چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تو ویسے بھی ہمارا اپنا بندہ ہے۔ اسے ایک کپ چائے پلائیں گے۔ تھوڑی دیر باہر کی رونق دیکھے گا تو اس کی طبیعت بہل جائے گی۔ دروازہ کھولو۔" چوکیدار نے دروازہ کھول دیا۔ اگر کوئی ڈاکٹر کسی مریض کو اسپتال سے باہر لے جانا چاہتا تھا تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

میو اسپتال کے اس مرکزی گیٹ کے سامنے اس وقت بھی رونق تھی۔ سامنے کئی میڈیکل اسٹور تھے۔ چھوٹی چھوٹی لاتعداد کیمیکل لیبارٹریز تھیں۔ ایک دو ریسٹورنٹ اور بہت سی ایسی دکانیں تھیں جو رات بھر کھلی رہتی تھیں۔ بالکل سامنے دکانوں کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی نسبت روڈ تھی۔ گیٹ کے سامنے والی سڑک دائیں طرف ہال روڈ کہلاتی تھی اور بائیں طرف اسپتال روڈ۔ اس کے ساتھ ہی بانسوں والا بازار تھا۔

سنیتا نے وہیل چیئر دائیں طرف موڑ دی۔ اس طرف اسپتال کے جنگلے کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ ایمبولینس اور کچھ اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سنیتا اور بشارت بظاہر مطمئن نظر آ رہے تھے لیکن ان کے دل کانپ رہے تھے۔ شکرے کی کیفیت بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ کسی بھی لمحے کچھ ہو سکتا تھا۔

چھ سات گاڑیاں چھوڑ کر سرخ رنگ والی شیراڈ کے قریب سنیتا نے وہیل چیئر روک لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"گاڑی کا دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔" بشارت نے سنیتا کی طرف دیکھے بغیر کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی لیکن ان کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔

سنیتا گھوم کر ڈرائیونگ سائیڈ کی طرف آ گئی۔ اس نے شرٹ کی جیب سے کی رنگ نکال کر پہلے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر گھس گئی اور دوسری طرف کا دروازہ

کھول دیا۔

وہیل چیئر دروازے کے ساتھ ہی تھی۔ ان دونوں نے شکرے کو وہیل چیئر سے کار میں منتقل کر دیا۔ بشارت نے دونوں رائفلیں بھی اندر ڈال دیں اور وہیل چیئر کو چند گز آگے لے جا کر چھوڑ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کی پچھلی سیٹ پر شکرے کے قریب بیٹھ گیا۔ شکرا سیٹ پر ترچھا ہو کر بیٹھا تھا تاکہ زخموں میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسی دوران سنیتا کار کا انجن اسٹارٹ کر چکی تھی۔

"ہال روڈ کی طرف لے چلو۔" بشارت نے کہا۔

سنیتا نے کار کو ریورس میں لیا اور پھر اس کا رخ ہال روڈ کی طرف موڑ دیا۔ اس وقت مخالف سمت سے ایک کار اس طرف آئی تھی۔ گاڑی موڑتے ہوئے سنیتا کی کار کا فنڈر دوسری کار سے ٹکرا گیا۔ اس کار کی انڈیکیٹر لائٹ ٹوٹ گئی۔ کار میں ایک ہی آدمی تھا۔ وہ انجن چالو چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ سنیتا اس وقت اپنی کار کو ایک بار پھر پیچھے لے رہی تھی۔

وہ بھاری بھرکم شخص اگرچہ مہذبانہ لباس پہنے ہوئے تھا مگر اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے تہذیب اسے چھو کر بھی نہ گزری ہو۔ اس نے پہلے جھک کر کار کی ٹوٹی ہوئی انڈیکیٹر لائٹ کا جائزہ لیا پھر سنیتا کی کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"بی بی۔ ذرا تھلے اترو۔ آکے دیکھو میری گڈی کا ستیاناس کر دیا ہے۔" اس کے لہجے سے تصدیق ہو گئی کہ وہ تہذیب سے آشنا بالکل نہیں تھا۔

"میں نیچے آکر کیا دیکھوں۔ غلطی تمہاری ہی ہے۔" سنیتا نے کھڑکی سے گردن نکالتے ہوئے کہا۔ "تم دیکھ رہے تھے کہ میں گاڑی اس طرف موڑ رہی ہوں۔ اس کے باوجود سامنے آگئے۔ ایک سیکنڈ کو رک جاتے تو قیامت نہ آجاتی۔ ہٹ جاؤ سامنے سے میں گاڑی اوپر چڑھا دوں گی۔"

"بلے بلے۔ شاوا بھئی شاوا۔" وہ شخص ڈرائیونگ سائیڈ پر آگیا۔ "اس کو کہتے ہیں چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اوئے..... میرے اوپر گڈی چڑھاؤ گی۔ شیدے پر گڈی چڑھاؤ گی۔"

"تم شیدے ہو یا کوئی اور۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔" سنیتا نے غرا کر کہا۔ اسے ڈر تھا کہ سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ اس طرف نہ آجائیں۔ لوگوں نے گاڑی

ٹکرانے کی آواز تو سنی ہی ہو گی اور ویسے بھی عورت کی ہمدردی میں لوگ بھاگے چلے آتے ہیں لیکن اس وقت لوگوں کی ہمدردی انہیں مہنگی پڑ سکتی تھی۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بشارت بھی اس صورت حال سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے دو پولیس والے بھی بیٹھے ہوئے تھے نظر آگئے تھے اور ڈر یہ تھا کہ وہ پولیس والے اس طرف نہ آجائیں۔

بشارت کار سے اتر آیا۔ اس نے دوسری کار کی ٹوٹی ہوئی لائٹ کا جائزہ لیا اور سفید کوٹ کے نیچے قمیض کی جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارا نقصان پورا کر دیتا ہوں شیدے پہلوان جی۔ مریض کو گنگا رام اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ دیر ہو گئی تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔"

"اوئے ڈاکٹر..... صرف سو روپے۔" اس شخص نے سو روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔

"دو سو روپے کی آتی ہے یہ بتی۔"

بشارت نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ میڈیکل اسٹور کے سامنے بیٹھا ہوا ایک کانسٹیبل اور دو اور آدمی اٹھ کر اس کی طرف آرہے تھے۔ بشارت کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس شیدے پہلوان نے انہیں پھنسانے کا پورا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ بشارت نے جلدی سے جیب سے سو کا ایک اور نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اب اس قصے کو ختم بھی کرو شیدے پہلوان جی۔"

"تم شریف آدمی لگتے ہو ڈاکٹر۔ پر اپنی سسٹر کو چنگی طرح سمجھا دو کہ پہلے گڈی چلانا سیکھے پھر سڑکوں پر آئے۔" شیدے پہلوان نے نوٹ مٹھی میں لیتے ہوئے کہا۔

"سمجھا دوں گا۔ چنگی طرح سمجھا دوں گا۔" بشارت کہتے ہوئے کار کے پچھلے دروازے کی طرف لپکا' اس دوران میں پولیس کانسٹیبل اور وہ دونوں آدمی پانچ چھ گز کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔

سنیتا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی اور اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ "بہت ہی خبیث آدمی تھا۔" وہ بڑبڑائی۔

"سر پر سے کیپ اتار دو ورنہ راستے میں کوئی اور خبیث مل جائے گا۔" بشارت نے کہا۔

سنیتا نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے سر پر لگی ہوئی نرسوں والی سفید کیپ اتارنے لگی۔ کیپ ہیئر پن سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے پن کھینچی تو چار بال بھی ساتھ آگئے۔ اس نے کیپ ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ دی اور دوسرا ہاتھ بھی اسٹیئرنگ پر جما دیا۔ اس دوران میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بشارت نے بھی اپنا سفید کوٹ اتار دیا تھا۔

"کس طرف جانا ہے؟" سنیتا نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ٹمپل روڈ کی طرف لے لو۔ وہاں سے اچھرے کی طرف نکل جائیں گے۔" بشارت نے جواب دیا۔

گاڑی میکلوڈ روڈ کراس کر کے تیزی سے ریگل چوک کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہال روڈ پر الیکٹرونکس کی دکانیں تھیں جو اس وقت بند تھیں۔ ریگل چوک پار کر کے کار ٹمپل روڈ پر دوڑنے لگی اور پھر شاہراہ جلال الدین رومی پر آگئی۔ یہ کشادہ سڑک نہر کو کراس کرتی ہوئی خیابان سہروردی اور ماڈل ٹاؤن کی طرف چلی گئی تھی۔ اس کشادہ سڑک پر آتے ہی سنیتا کار کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔

"رفتار زیادہ مت بڑھاؤ۔" بشارت نے کہا۔ "ایسا نہ ہو پولیس کی کوئی گاڑی ہمارے پیچھے لگ جائے۔"

سنیتا نے رفتار کم کر دی۔ اچھرے کے مرکزی چوراہے پر خاصی رونق تھی۔ اس بارونق علاقے سے آگے نکل کر سنیتا نے بشارت کے کہنے پر کار کو دائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ لیا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا اور اس سڑک پر سناٹا تھا۔

بشارت کی ہدایت پر سنیتا کار کو مختلف چھوٹی سڑکوں پر گھماتی رہی اور آخر کار علامہ اقبال ٹاؤن کے مین بلے وارڈ پر نکل آئے۔ اس علاقے میں بھی اس وقت خاصی رونق تھی۔

"کار ذرا سائیڈ پر روک لو۔ یہاں سے ایک دو چیزیں لینی ہیں۔" بشارت نے کہا۔

سنیتا نے شاپنگ سینٹر سے کافی دور کار روک لی۔ یہاں کسی قدر تاریکی تھی اور لوگوں کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔ بشارت کار سے اتر کر شاپنگ سینٹر کی طرف گیا۔ اس نے ایک بیکری سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں۔ باہر آکر ایک کیبن سے شکرے کے سگریٹ کے دو پیکٹ خریدے۔ رات بھر کھلے رہنے والے ایک میڈیکل اسٹور سے کچھ

کلرز گولیاں خریدیں اور اس طرف آگیا جہاں وہ کار سے اترا تھا۔

کار وہاں نہیں تھی۔ بشارت پریشان نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ دائیں طرف دوسری سڑک پر مڑ گیا۔ اسی وقت شاپنگ سینٹر کے مخالف سمت سے آنے والی ایک موٹر سائیکل اس کے قریب آکر رکی۔ وہ دو پولیس والے تھے۔ آگے والے کی رائفل اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی تھی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے کانسٹیبل نے رائفل ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر آیا۔

"اوئے' کون ہو تم..... یہاں کیا کر رہے ہو؟" کانسٹیبل نے قریب آکر اسے گھورا۔ وہ کانسٹیبل تھا لیکن اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اپنے سے بہت حقیر آدمی سے بات کر رہا تھا۔ یہ دراصل اس کی وردی کا کمال تھا۔ پولیس کی وردی پہن کر ایک معمولی سا کانسٹیبل بھی اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھنے لگتا ہے۔

"میں اپنی گاڑی تلاش کر رہا ہوں۔" بشارت نے جواب دیا۔ "ڈرائیور کو شاپنگ سینٹر کے سامنے ہی رکنے کو کہا تھا۔ پتہ نہیں کس طرف چلا گیا ہے۔"

"اس کو اسی طرف جا کر دیکھو۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔"

کانسٹیبل نے کہا۔ وہ بشارت کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپنگ بیگ' اس کے لباس اور شریفانہ چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ اس نے غلط آدمی کو روکا ہے۔

"چل یار۔ آگے چل۔" کانسٹیبل اپنے ساتھی سے کہتا ہوا موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی۔

بشارت وہیں کھڑا رہا' تقریباً دو منٹ بعد کار اس کے قریب آکر رکی۔ بشارت دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں؟" اس نے شاپنگ بیگ پچھلی ونڈ اسکرین کے ساتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"موٹر سائیکل پر دو شرطے گھوم رہے تھے۔" سنیتا نے کار آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "کار یہاں کھڑی دیکھ کر وہ مشتبہ ہو گئے تھے اس لئے میں یہاں رکے رہنے کے بجائے اسی طرف نکل گئی تھی۔"

"وہ کسی شکار کی تلاش میں ہیں۔" بشارت نے جواب دیا۔ "یہاں کھڑے دیکھ کر انہوں

نے مجھے بھی گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن شاید میری شرافت سے متاثر ہو کر چلے گئے۔"

"چہرے سے تو تم واقعی شریف آدمی لگتے ہو لیکن بتاؤ اب جانا کدھر ہے۔ کوئی ٹھکانا بھی ہے یا رات بھر سڑکوں پر ہی گھماتے رہو گے۔" سنیتا نے کہا۔

"مین روڈ پار کر کے سامنے والے بلاک میں لے لو۔" بشارت نے جواب دیا اور شکرے کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ "مجھے معلوم ہے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے لاہور شہر کی کھنڈروں جیسی سڑکوں پر سفر کرتے ہوئے اچھے بھلے آدمی کے کل پرزے ڈھیلے ہو جاتے ہیں اور تم تو ویسے بھی زخمی ہو لیکن اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں رہ گئی۔"

سنیتا نے مین روڈ پار کر کے سامنے والے بلاک کی ایک تنگ سی سڑک پر موڑلی۔ یہ سڑک نہیں بلکہ کچا راستہ تھا۔ اس بلاک میں بلدیہ کی طرف سے ابھی کسی قسم کا ترقیاتی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ بہت سے پلاٹ خالی تھے۔ کچھ پر تعمیر ہو رہی تھی اور گھرین کر آباد ہو چکے تھے۔ سنیتا نے کار کی رفتار اگرچہ بہت ہلکی کر رکھی تھی مگر کچے راستوں پر کار کو دھچکے لگ رہے تھے۔ آخر کار بشارت نے کار ایک کوٹھی کے سامنے رکوالی۔

کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بشارت نے کار سے اتر کر جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور گیٹ کھول دیا۔ سنیتا کار کو اندر لے آئی۔ بشارت گیٹ بند کر کے آگے آگیا اور برآمدے والا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا اور کمروں کی بتیاں جلادیں۔

وہ دونوں شکرے کو کار سے اتار کر اندر ایک کمرے میں لے گئے اور اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ شکرے کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ چند سیکنڈ بیٹھا رہا اور پھر بیڈ پر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے جسم پر قمیض نہیں تھی۔ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بشارت کو اندیشہ تھا کہ کسی زخم کے ٹانکے نہ کھل گئے ہوں۔ وہ جھک کر شکرے کے جسم پر بندھی ہوئی پٹی کو دیکھنے لگا۔ اگر ٹانکے کھل گئے ہوتے تو زخموں سے خون رسنے لگتا لیکن پٹی خشک تھی۔ کار کا دھچکے لگنے سے اسے تکلیف ہوئی تھی۔ بشارت اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ سنیتا گھوم کر کوٹھی دیکھنے لگی۔ وہ آج پہلی مرتبہ یہاں آئی تھی۔

"تکلیف زیادہ تو نہیں ہو رہی؟" بشارت نے پوچھا۔

"ابھی تو قابل برداشت ہے۔ آگے دیکھو۔" شکرے نے کراہتے ہوئے جواب دیا اور

گردن گھما کر بشارت کی طرف دیکھنے لگا۔

اس دوران میں سنیتا بھی واپس آگئی۔

"کوٹھی تو اچھی ہے مگر کرایہ بہت زیادہ ہے۔ چھ ہزار روپے بڑی رقم ہوتی ہے۔" سنیتا نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہ کوٹھی سکیورٹی کے نقطہ نظر سے لی ہے اور پھر یہاں ٹیلی فون بھی ہے۔ اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ کرایہ زیادہ نہیں ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔ "لیکن میرا خیال ہے کرائے پر بحث کرنے کے بجائے ہمیں اس وقت چائے کی زیادہ ضرورت ہے کار میں جھٹکے لگنے سے شکرے کو بھی درد ہو رہا ہے۔ اسے کچھ کھلا پلا کر ایک گولی کھلا دی جائے تاکہ تکلیف بڑھنے نہ پائے۔"

"گولی!" سنیتا نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ پین کلرز لے آیا ہوں۔ ان سے درد میں افاقہ تو ضرور ہو گا اور ان سے کسی ری ایکشن کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ آؤ..... تمہیں کچن دکھادوں۔" بشارت کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

وہ دونوں کچن میں آگئے۔ وہ سنیتا کو بتانے لگا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی ہے۔ پھر وہ کار سے شاپنگ بیگ بھی نکال لایا۔ اس نے سگریٹ کے پیکٹ ماچس اور دواؤں والی تھیلی نکال لی اور بیگ سنیتا کے حوالے کر کے شکرے والے کمرے میں چلا گیا۔

کچن کے سلیب پر ٹیس کا چولہا رکھا ہوا تھا اور نیچے گیس سلنڈر بھی موجود تھا۔ سنیتا نے چولہا جلا کر چائے کے لئے پانی رکھ دیا اور کچن کا جائزہ لینے لگی۔ ضرورت کی تقریباً ہر چیز موجود تھی۔

سنیتا اس وقت بھی اپنے آپ میں عجیب سی سنسنی محسوس کر رہی تھی۔ وہ زندگی کے ایک اور سنسنی خیز تجربے سے گزری تھی۔ ایک ایک لمحہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ اگر وہ پکڑے جاتے تو انجام کیا ہوتا؟ یہ سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی۔

اس نے چائے کپوں میں انڈیلی' شاپنگ بیگ میں سے چیزیں نکال کر پلیٹ میں رکھیں اور ٹرے اٹھا کر شکرے والے کمرے میں آگئی۔ شکرا بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر کسی قدر آڑا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تکیہ بھی پیچھے رکھا ہوا تھا۔ سنیتا نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ ایک کپ

بشارت کی طرف سرکا دیا اور ایک شکرے کے ہاتھ میں دے دیا اور پلیٹ بھی اس کے سامنے رکھ دی جس میں کیک اور بسکٹ وغیرہ تھے۔ بشارت نے اسے ایک گولی کھلا دی اور پھر وہ چائے پینے لگے۔

"سگریٹ پلاؤ یار۔" شکرے نے دو گھونٹ چائے پینے کے بعد کہا۔ "آج صبح سے سگریٹ ہی نصیب نہیں ہوا۔"

بشارت نے ایک سگریٹ سلگا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شکرے نے دو تین بھرپور کش لگائے اور پھر بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اسپتال کے کمرے میں تم لوگوں کی کارروائی دیکھ کر میں پریشان ہو گیا تھا اور جب تم لوگوں نے مجھے اٹھانے کی کوشش کی تو میرے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ میں سمجھا پتہ نہیں کون لوگ ہیں اور مجھے کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ سگریٹ کا ایک اور کش لگایا اور بولا۔ "پر تمہیں کیسے پتہ لگا کہ میں اسپتال میں ہوں یا کہاں ہوں۔"

"میں ایک لمحے کو بھی تمہاری طرف غافل نہیں ہوا تھا شکرے۔" بشارت نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم شروع ہی سے تمہاری نگرانی کروا رہے تھے۔ ایک ایک پل کی خبر رکھی تھی اور جب آج پتہ چلا کہ کل تمہیں جیل وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا تو میں نے تمہیں اسپتال سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ تم جیل وارڈ میں چلے گئے تو تم تک پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔"

"اور اگر تم لوگ پکڑے جاتے تو؟" شکرا بولا۔

"تھوڑا بہت خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔" بشارت مسکرایا۔

"ویسے میں تمہیں بالکل نہیں پہچان سکا تھا۔" شکرے نے کہا۔ "داڑھی بڑھا لینے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر تمہاری آنکھیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری آنکھیں تو کالی تھیں مگر یہ نیلی آنکھیں۔"

"آج کل آنکھیں تو کیا خون کا رنگ بھی بدلا جا سکتا ہے۔" بشارت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے آنکھوں کا رنگ بدلنے کا مشورہ مجھے سنینا نے دیا تھا۔"

"سنینا....." شکرا بولا۔ "تم نے اس کے بارے میں کچھ بتایا نہیں اور میں تو یہ بھی جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ اس روز کیا ہوا تھا۔ گولیاں لگنے کے بعد جب میری آنکھوں

کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

"اس روز۔" بشارت گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اگر سنینا بروقت میری مدد نہ کرتی تو اس روز میں بھی مارا جاتا۔" وہ چند کو لمحوں خاموش ہوا پھر اس روز کے بعد سے اب تک کے واقعات تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "میں تو گھر میں بند ہو کر رہ گیا تھا اور یہ سنینا ہی تھی جو نرسوں کے ذریعے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کرتی رہی تھی۔"

"پھر تو مجھے سنینا کا زیادہ شکریہ ادا کرنا چاہئے۔" شکرے نے مسکرا کر سنینا کی طرف دیکھا۔

سنینا نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

سنینا نے چائے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھ دیئے اور دوبارہ اس کمرے میں آ گئی۔ وہ موجودہ صورت حال کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پولیس کو اسپتال والے واقعے کی خبر ہو گئی ہو گی اور پورے شہر میں ان کی تلاش ہو رہی ہو گی۔ شکرا زخمی تھا۔ پولیس سب سے زیادہ پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکوں پر توجہ دے گی۔ پولیس کو یقین رہا ہو گا کہ شکرے کو علاج کی ضرورت ہے اور اسے کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس ضرور لے جایا جائے گا لیکن بشارت نے اس کا بھی حل سوچ رکھا تھا۔ شکرے کو یقیناً علاج کی ضرورت تھی لیکن ظاہر ہے وہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جا سکتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہے اس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔

وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شکرے پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی۔ بشارت سنینا کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔

"تمہیں رات کو پریشانی تو نہیں ہو گی۔" بشارت نے شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم کہو تو میں اپنی چارپائی بھی یہاں تمہارے قریب ڈال لوں؟"

"نہیں' اب تو میں پہلے سے بہتر ہوں' اپنے آپ اٹھ کر بیٹھ بھی جاتا ہوں اور دو چار قدم چل بھی لیتا ہوں۔ اس لئے تو مجھے جیل وارڈ میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ وہ تو کار کے جھٹکے لگنے سے کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہوں جاؤ تم لوگ بھی سو جاؤ۔ صبح باتیں ہوں گی۔" شکرے نے کہا۔

وہ دونوں اس کے کمرے سے باہر آ گئے۔ اس کوٹھی میں تین بیڈ رومز تھے۔ تینوں

کمروں میں بشارت نے ایک ایک بیڈ اور کچھ ضروری فرنیچر ڈلوا دیا تھا۔ ہال کمرے میں بھی ایک صوفہ سیٹ اور چند کرسیاں ڈلوا دیں تھیں۔ اس سارے سیٹ اپ پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب رقم خرچ ہوئی تھی۔

"یہ تمہارا کمرہ ہے۔" بشارت نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر سنیتا کی طرف دیکھا۔

"تم یہاں سو جاؤ اور میں ساتھ والے کمرے میں....."

"میں..... میں یہاں اکیلی سوؤں گی۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "نہیں بھئی..... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ میں اکیلی نہیں سوؤں گی۔"

"اور اپنے گھر میں جو اکیلی رہتی ہو؟" بشارت نے اسے گھورا۔ "وہاں تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"وہاں چاروں طرف آبادی ہے' گھر سے گھر ملے ہوئے ہیں۔ چھینک بھی مارو تو پڑوسیوں کو پتہ چل جاتا ہے اور یہاں..... دور دور تک ویرانہ ہے۔ قرب و جوار میں کوئی مکان آباد نہیں۔ نہیں بھئی۔ میں اس کمرے میں اکیلی نہیں سو سکتی۔" سنیتا نے کہا۔

"پھر کہاں سوؤ گی؟" بشارت نے اسے گھورا۔

"تمہارے ساتھ..... میرا مطلب ہے تمہارے کمرے میں۔" وہ جلدی سے بولی۔

یوں تو بشارت سنیتا کے ساتھ اس کے گھر میں اکیلا ہی رہ رہا تھا لیکن وہ الگ الگ کمروں میں سوئے تھے۔ اس نے ایک رات سنیتا کے ساتھ اس کے دفتر والے کمرے میں بھی گزاری تھی لیکن اس وقت صورت حال مختلف تھی۔

"اپنا بیڈ اسی کمرے میں لے آؤ یا میرا بیڈ اپنے کمرے میں لے چلو۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اکیلی نہیں سوؤں گی۔"

سنیتا نے کہا اور اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر بیڈ پر بچھا ہوا بستر سمیٹنے لگی۔

وہ دونوں مل کر بیڈ بشارت والے کمرے میں لے آئے جو شکرے کے کمرے کے عین سامنے تھا۔ سنیتا بستر بچھاتے ہی بیڈ پر لیٹ گئی۔ بشارت نے شکرے کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ سو چکا تھا۔ اس نے تمام دروازے وغیرہ چیک کئے۔ پولیس والوں کی دونوں رائفلیں اپنے کمرے میں رکھ لیں۔ ویسے اسے یقین تھا کہ فوری طور پر انہیں رائفلوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ سنیتا کی بھی آنکھیں بند تھیں۔ بشارت نے ٹیوب لائٹ بند کر کے نیلگوں روشنی والا نائٹ بلب جلا دیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ وہ ایک بار پھر گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ پہلے صرف جیب کترا تھا پکڑے جانے کی صورت میں اس جرم کی سزا مہینہ دو مہینہ یا زیادہ سے زیادہ تین چار مہینے کی سزا ہو سکتی تھی لیکن اب وہ قاتل بن چکا تھا گزرنے والے ہر دن کے ساتھ وہ اس دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ شبنم کے آدمیوں سے تصادم میں ایک آدمی اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن شبنم کسی بھی وقت پولیس کو اس کا نام دے سکتی تھی اور وہ سنیتا کو کچھ ایسی دھمکی بھی دے چکی تھی۔

اور پھر آج کا واقعہ.....! پولیس شکرے کو بھی چوہدری عمر کے گن مینوں کا قاتل گردان رہی تھی۔ انہیں شکرے کے اس ساتھی کی بھی تلاش تھی جو اس روز رقم سے بھرا ہوا بیگ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شکرا تین ہفتوں سے پولیس کی حراست میں تھا۔ وہ موت کے منہ سے لوٹا تھا اور بڑی تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ چند روز بعد پولیس اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کرنے والی تھی لیکن بشارت اسے پولیس کی حراست سے نکال لایا تھا۔ یہ بھی ایک سنگین ترین جرم تھا۔ پولیس ان کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دے گی اور اگر وہ پکڑا گیا تو دنیا کی کوئی طاقت اسے پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکے گی۔

وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور اب اس کے لئے واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ بشارت یہی سب کچھ سوچتے ہوئے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

بشارت گہری نیند میں تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے سینے پر کسی قسم کا بوجھ پڑ رہا ہے۔ اسے سانس لینے بھی میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی مگر یوں لگا جیسے آکٹوپس نے اسے گرفت میں لے رکھا ہو۔ وہ اپنے آپ کو اس گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ دماغ پر نیند کے خمار کی وجہ سے پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں سکا پھر اچانک ہی نیند کافور ہو گئی اور اس کے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔

سنیتا اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بشارت کے سینے پر تھا اور ایک ٹانگ بھی اس کی ٹانگ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ نائٹ بلب کی مدھم نیلگوں روشنی میں پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ بشارت

کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے پہلے سنیتا کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹایا پھر ٹانگ آزاد کرائی۔ اور بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر آگیا۔

فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر ہونٹوں سے لگائی۔ برف جیسے ٹھنڈے پانی نے ایک لمحے کو اس کے دماغ کو بھی سن کر دیا لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس کے دماغ کی تپش کم ہو گئی اور سینے میں بھی ٹھنڈ سی پڑ گئی۔

اس نے شکرے کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بشارت اندر جانے کے بجائے لوٹ کر کچن میں آگیا اور چائے بنانے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ ٹرے میں پانی کا گلاس اور چائے کے دو کپ رکھ کر شکرے کے کمرے میں آگیا۔ ٹرے اس نے میز پر رکھی اور شکرے کو سہارا دے کر اٹھا دیا۔

"رات کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" اس نے پانی کا گلاس شکرے کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو تمہارے جاتے ہی سو گیا تھا۔ صبح سویرے میاں جی کی بانگ سے آنکھ کھل گئی۔" اس نے پانی کا گھونٹ بھر کر ایک طرف فرش پر کلی کر دی اور چند گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس بشارت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس سے چائے کا کپ لے لیا۔ چائے پیتے ہوئے وہ پچھلی باتیں تازہ کرنے لگے۔

"استاد گنگو والا ڈیرہ تو شاید اب کبھی آباد نہ ہو سکے گا۔" بشارت نے کہا۔

"کیوں؟" شکرے نے اسے گھورا۔ "میں اور تم ہی وہاں سے نکلے ہیں۔ وارا تو موجود ہے۔ وہ باقی لڑکوں کو سنبھال لے گا۔"

"رات کو میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔" بشارت نے کہا۔ "چاچا جانو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ تمام لڑکے بھاگ گئے ہیں۔ وہ ڈیرہ اب پولیس کے قبضے میں ہے۔" وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر اسے بتانے لگا کہ اس رات ڈیرے پر کیا ہوا تھا۔

"اوہ۔" شکرا اس کے خاموش ہونے پر بولا۔ "مجھے جانو چاچا کی موت کا بہت افسوس ہوا۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"ایک دن شاید ہمارا بھی یہی انجام ہو اور ہمارے لئے نہ تو کوئی افسوس کرنے والا ہو گا اور نہ آنسو بہانے والا۔" بشارت نے کہا اس کے لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔

"اور یہ سنیتا کون ہے؟ رات کو تم نے اس کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا تھا۔" شکرے نے کہا۔

"سنیتا بھی ہماری طرح زمانے کی ستائی ہوئی ہے۔" بشارت نے کہا۔ "میں ابھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اس نے جو کہانی سنائی ہے وہ واقعی بڑی دردناک ہے۔ بقول سنیتا کے اسے مجھ جیسے کسی ساتھی کی ضرورت تھی جو شبنم جیسی عورتوں سے اس کی حفاظت کر سکے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر سنیتا کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "اس روز اگر یہ مجھے نہ بچاتی تو شاید میں بھی اسپتال میں تمہارے ساتھ والے بیڈ پر پڑا ہوتا۔"

"سنیتا کی کہانی واقعی افسوسناک ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس پر یقین نہیں آرہا۔" شکرے نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"کیا مطلب؟" بشارت نے اسے گھورا۔ "کوئی شبہ ہے اس پر لیکن تم تو پہلی مرتبہ اس سے ملے ہو۔ پوری طرح ایک دوسرے سے متعارف بھی نہیں ہوئے۔"

"میری زندگی جرائم پیشہ لوگوں میں رہتے ہوئے گزری ہے جس طرح ایک جیب کترے کی حیثیت سے میں کسی بندے کو دور سے ہی دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اس کی جیب میں کتنی رقم ہو سکتی ہے اسی طرح کسی کا چہرہ دیکھ کر بھی بتا سکتا ہوں کہ وہ کون ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ تمہاری یہ سنیتا مجھے بہت گہری لگتی ہے۔ بہت ہی ڈونگی۔"

"لیکن میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس نے کم از کم دو مرتبہ مجھے پولیس سے بچایا ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک موقع پر بھی پولیس کے ہاتھ لگ جاتا تو مجھے ختم کر دیا جاتا۔ لیکن دونوں مرتبہ اس نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا اور تمہیں اسپتال سے نکالنے کے لئے بھی اس نے میرا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ اگر میں مجرم ہوں تو وہ بھی اب میرے جرائم میں برابر کی شریک ہے۔ وہ بھی پولیس کو اتنی ہی مطلوب ہو سکتی ہے جتنا میں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ میرے ساتھ کوئی دھوکا کر رہی ہے تو وہ کیا کر لے گی۔"

"یہ بات تو ابھی میری سمجھ میں بھی نہیں آسکی۔" شکرے نے اس کے خاموش ہونے

پر کہا۔ "پر نہ جانے کیوں میرا من اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔"

بشارت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر قدموں کی بہت ہلکی سی چاپ سن کر خاموش ہو گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی سنیتا دروازے میں نمودار ہوئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں کو گردن پر سمیٹے ہوئے جُوڑا بنا رہی تھی۔

"ارے واہ!" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ "یہاں چائے اڑائی جا رہی ہے اور مجھے پوچھا تک نہیں۔"

"سوتے میں تو تمہارے حلق میں گرم گرم چائے نہیں انڈیلی جا سکتی تھی۔" بشارت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہمارے کپ خالی ہو چکے ہیں اور اگر تم کچن تک جاتے ہوئے کسی قسم کا خوف محسوس نہ کرو تو ہم بھی ایک ایک کپ اور پی لیں گے۔"

"خوف..... کس بات کا خوف؟" سنیتا نے اسے گھورا۔

"ویرانے میں یہ مکان..... قرب و جوار میں کوئی گھر آباد نہیں۔ شاید تمہیں کسی قسم کا ڈر لگ رہا ہو۔" بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کو سنیتا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بشارت کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور اسے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

"ایک سگریٹ سلگا کر دو اور مجھے ذرا باتھ روم تک لے چلو۔" شکرے نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بشارت نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا دیا۔ ایک کش لگاتے ہی اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے سگریٹ شکرے کی طرف بڑھا دیا۔

"پتہ نہیں تم یہ زہر کیسے پیتے ہو۔" اس نے کہتے ہوئے شکرے کو سہارا دے کر بیڈ سے اتار دیا۔ "اس وقت تو میرا جوتا پہن لو۔ آج چپلوں وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ شکرے کو اسپتال سے لائے تھے تو ظاہر ہے وہ ننگے پیر تھا۔ بشارت نے اسے جوتا پہنا دیا اور اسے سہارا دے کر چلاتا ہوا باتھ روم تک لے گیا۔ اسے باتھ روم میں چھوڑ کر وہ خود کمرے سے بھی باہر آ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ شکرے ہی کے کمرے میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ "ارے ہاں۔" بشارت شکرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے حصے کی رقم میرے پاس رکھی

ہے۔ جب ضرورت سمجھو لے لینا۔"

"کیسا حصہ..... کیسی رقم.....؟" شکرے نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔" بشارت نے کہا۔ "اس روز میں جو بیگ لے کر بھاگا تھا اس میں سے چار لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم برآمد ہوئی تھی جس میں سے دس ہزار کے نوٹوں کا ایک بنڈل ضائع ہو چکا ہے۔ اصولی طور پر تو سنیتا کا بھی حصہ ہونا چاہئے لیکن وہ اس سے دستبردار ہو چکی ہے بلکہ اس رقم پر اپنا حق ہی نہیں سمجھتی۔ ساڑھے چار لاکھ میں آدھی رقم تمہارے حصے میں آئی ہے جب چاہو لے لینا۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" شکرے نے اسے گھورا۔ "جب ہم لوگوں کی جیبیں کاٹا کرتے تھے تو حصے تو ہم نے اس وقت بھی نہیں کئے تھے۔ وہ رقم تم اپنے پاس ہی رکھو اور اسے استعمال کرتے رہو۔"

"اور جانتے ہو تمہارا وہ شکار کون تھا۔" بشارت نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔ "چوہدری عمر کا مینیجر تھا جو بینک سے رقم نکلوا کر آ رہا تھا۔"

"چوہدری عمر کون؟" شکرے نے پوچھا۔

"وہی مہاجن جس نے ہمارے مکان پر قبضہ کر کے فروخت کر دیا تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔

"تو گویا تمہیں تمہارا حق مل گیا۔" شکرے نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "اس طرح اس رقم پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ میں تو ایک ذریعہ بن گیا تھا وہ رقم تم تک پہنچانے کا۔"

سنیتا خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ شکرے کی طرف سے رقم سے دستبردار ہونے کا سن کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ وہ بڑی رقم تھی اور اس کے لئے شکرے نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اور اب اس کا خیال تھا کہ شکرا ٹھیک ہوتے ہی بشارت سے رقم کا مطالبہ کرے گا لیکن اس نے رقم سے دستبردار ہونے کا اعلان کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔

☆=====☆=====☆

باہر کے حالات کا انہیں کچھ پتہ نہیں تھا اور صورت حال سے آگاہ رہنا ان کے لئے

ضروری تھا۔ رات کو اس طرف آتے ہوئے سڑک پر بشارت نے چند دکانیں دیکھی تھیں۔ وہ دکانیں اگرچہ بند تھیں مگر ایک دکان پر بک اسٹور اینڈ نیوز پیپر ایجنسی کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا اور بشارت کا خیال تھا کہ وہاں سے اخبار ضرور مل جائے گا۔

بشارت سنیتا سے کہہ کر کوٹھی سے باہر چلا گیا۔

وہ سات آٹھ دکانیں تھیں جن میں ایک سائیان ٹائپ کا ہوٹل بھی تھا جہاں مزدور پیشہ لوگ کھانا وغیرہ کھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بک اسٹال تھا۔ بشارت نے بک اسٹال سے اخبار اور اپنی پسند کی ایک دو کتابیں خریدیں۔ دوسری دکانوں سے بھی کچھ سودا خریدا اور واپس آگیا۔ اس نے اخبار ابھی تک کھول کر نہیں دیکھا تھا۔

جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا تو سنیتا کے جسم پر بدلے ہوئے کپڑے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ..... یہ کپڑے کہاں سے آئے؟" اس نے سنیتا کو گھورا۔

"دو دن پہلے کپڑے لانڈری پر دینے کے لئے گٹھڑی باندھ کر کار کی ڈگی میں رکھے تھے لیکن لانڈری پر دینا یاد نہیں رہتا تھا۔ اس وقت اتفاق سے یاد آگیا تو میں نے وہ گٹھڑی نکال لی۔ نرس کا ڈریس پہنے ہوئے مجھے ویسے بھی الجھن ہو رہی تھی اور ان کپڑوں میں تو میں باہر بھی نہیں جا سکتی تھی۔"

"اور تمہاری عینک کہاں ہے؟" بشارت نے پوچھا۔

"کار کے ڈیش بورڈ میں کیپ کے ساتھ رکھی ہوئی ہے۔" سنیتا نے کہا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے شکرے والے کمرے میں آگئے۔ بشارت شکرے کے لئے ہوائی چپل بھی لے آیا تھا جو اس نے تھیلے میں سے نکال کر اس کے بیڈ کے قریب رکھ دی اور اخبار کھول لیا۔

وہ خبر پہلے ہی صفحے پر تھی لیکن سرخی پڑھتے ہی وہ اچھل پڑا۔ گزشتہ رات جن تین پولیس والوں کو انہوں نے اسپتال والے کمرے کے باتھ روم میں بے ہوش کر کے بند کیا تھا ان میں سے ایک ہلاک ہو گیا تھا۔ بشارت اونچی آواز میں وہ خبر پڑھتا چلا گیا۔

وہ ایک نہیں اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اور بھی تین چار خبریں تھیں۔ ایک خبر یہ تھی کہ پرائیوٹ وارڈ کی نرس اور نائٹ ڈیوٹی کا ایک ڈاکٹر اپنے ڈیوٹی روم میں بے ہوش پڑے پائے گئے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور دونوں کے منہ میں کپڑے ٹھنسے ہوئے

تھے۔

پولیس کے ذرائع کے مطابق شکرا نامی اس خطرناک قیدی کو چھڑانے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ پہلے ڈاکٹر اور نرس کو بے ہوش کر کے ڈال دیا گیا اور پھر پولیس والوں کو بے بس کر کے قیدی کو چھڑا لیا گیا۔ پولیس کا خیال یہ بھی تھا کہ اس منصوبے میں شامل عورت نے اہم کردار ادا کیا تھا کیونکہ ہیڈ کانسٹیبل کے گال پر لپ اسٹک سے ہونٹوں کا نشان بنا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل اور ایک سنتری کو فرائض سے غفلت برتنے کے الزام میں ملازمت سے برخاست کر کے حراست میں لے لیا گیا ہے جبکہ تیسرا سنتری دماغ کی نس پھٹنے سے ہلاک ہو گیا تھا۔ پولیس کے ترجمان کے مطابق اس کے سر پر کاری ضرب لگائی گئی تھی جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

تمام واقعہ بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ زندہ بچ جانے والے سنتری اور ہیڈ کانسٹیبل کے بھی بیانات تھے اور ڈیوٹی روم میں بے ہوش پائے جانے والے ڈاکٹر اور نرس کے بیانات بھی شائع ہوئے تھے۔

پولیس نے اس واقعے کا علم ہوتے ہی پورے شہر میں ملزمان کی تلاش شروع کر دی تھی اور تمام پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکوں کی بھی نگرانی شروع کر دی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ زخمی قیدی کا علاج کرانے کے لئے کسی پرائیویٹ اسپتال یا کلینک میں کوشش کی جائے گی اور اس طرح پولیس بہت جلد ان کا سراغ لگا لے گی۔

"رات کو جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو میرے اندر سنسنی اور خوف کی ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔" شکرے نے کہا۔ "لیکن اخبار کی ان خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ سنگین تھی۔"

"ہاں..... مجھے بھی اب یہی احساس ہو رہا ہے۔" بشارت نے کہا۔ "ان کا خیال ہے کہ ہم تمہیں علاج کے لئے کسی پرائیویٹ اسپتال یا کلینک لے جائیں گے اور اس طرح دھر لئے جائیں گے۔"

"مجھے اب علاج کی ضرورت نہیں۔" شکرے نے کہا۔ "زخم بھر گئے ہیں۔ معمولی سی تکلیف ہے۔ چند روز آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"آرام کے علاوہ ابھی تمہیں علاج کی بھی ضرورت ہے' اور میں نے اس کا بندوبست

بھی کر لیا تھا۔ تمہیں اسپتال سے نکالنے کا منصوبہ بناتے ہوئے ہر بات میرے ذہن میں تھی۔" بشارت نے کہا۔

اس روز وہ وقتاً فوقتاً اسی صورت حال پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اس دوران میں سنینا نے اپنا کپڑوں کا ایک جوڑا بھی دھو کر دھوپ میں ڈال دیا تھا۔ واش اینڈ ویئر قسم کے اس کپڑے کو استری کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔

"اگر ہمیں چند روز یہیں رہنا ہے تو مجھے کچھ چیزوں کی ضرورت پڑے گی اور اس کے لئے مجھے باہر جانا پڑے گا۔" سنینا نے کہا۔

"باہر جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔" بشارت نے کہا۔ "وہ پولیس والے اور نائٹ ڈیوٹی کی نرس اور ڈاکٹر۔ ان میں سے کوئی بھی ہمارا حلیہ واضح طور پر نہیں بتا سکتا۔ اس طرح اچانک افتاد پڑ جانے پر خوفزدہ ہو جانے والا شخص بدحواس ہو جاتا ہے اور وہ کسی کا چہرہ یاد نہیں رکھ سکتا اور تم ویسے بھی نرس کے ڈریس میں تھیں۔ آنکھوں پر عینک بھی تھی اور اس وقت تو تم بالکل ہی بدلی ہوئی ہو۔ تمہیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ وہی نرس ہے جو رات کو اپنے ایک ساتھی کے ساتھ زخمی قیدی کو چھڑا کر لے گئی تھی۔ ہمیں خیال صرف اس بات کا رکھنا ہے کوئی مشتبہ شخص ہمارے پیچھے یہاں تک نہ آنے پائے۔ ویسے آج تم اسپتال جاؤ گی اور اس نرس سے صورت حال معلوم کرو گی۔"

"کیا.....؟" سنینا اچھل پڑی۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔" بشارت نے کہا "مجھے یقین ہے تمہیں کوئی پہچان نہیں سکے گا اور اگر کچھ ہوا تو دیکھا جائے گا۔"

بشارت نے شکرے کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ چار بجے کے قریب سنینا تیار ہو گئی۔ اس نے بیگ میں رکھی ہوئی چیزوں سے چہرے پر ہلکا سا میک اپ کر لیا تھا۔ بشارت نے ایک رائفل شکرے کے بیڈ کے قریب رکھ دی تھی۔ باہر نکلتے ہوئے انہوں نے تمام دروازے بند کر دیئے اور گیٹ کو بھی باہر سے تالا لگا دیا تھا۔

اسپتال روڈ والے گیٹ کی طرف آنے کے بجائے سنینا نے بشارت کی ہدایت کے مطابق کار نیلا گنبد کی طرف موڑ لی تھی۔ اس طرف بھی اسپتال کا ایک بڑا گیٹ تھا جو عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔ پیدل آمدورفت کے لئے ایک ذیلی دروازہ تھا۔ سنینا نے کار گیٹ سے کافی

دور کھڑی کر دی اور وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے اس ذیلی دروازے میں داخل ہو گئے۔ وہ مریضوں سے ملاقات کا وقت تھا اور اچھے خاصے لوگوں کی آمدورفت تھی۔

سنینا کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ شولڈر بیگ پر ٹکا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بشارت کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ گزشتہ رات ڈاکٹر کے ڈریس میں بشارت اسپتال میں آیا تھا تو اس نے بالوں کی مانگ درمیان سے نکال رکھی تھی اور اب مانگ بائیں طرف سے نکلی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ بھی تھا۔ ان دو معمولی سی تبدیلیوں سے اس کا حلیہ بدل گیا تھا اور فوری طور پر ڈاکٹر کی حیثیت سے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔

اسپتال کا وہ بلاک وہاں سے بہت دور تھا۔ اس طرف سے آنے والوں لوگوں کو بہت طویل فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔

اس بلاک کے سامنے گھاس کا وسیع پلاٹ تھا۔ کچھ کنکریٹ کے بینچ بھی رکھے ہوئے تھے۔ لوگ بینچوں پر بھی بیٹھے ہوئے تھے اور ٹولیوں کی صورت میں گھاس پر بچے بھی اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بشارت ایک درخت کے نیچے رک گیا۔

"تم جاؤ.....میں یہاں کھڑا ہوں۔"

سنینا نے خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئے بلاک کی طرف چلنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ کا انگوٹھا شولڈر بیگ کے اسٹریپ میں پھنسا رکھا تھا۔

اس نرس کو تلاش کرنے میں سنینا کو دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ "تم یہاں کیوں آئی ہو۔" نرس سنینا کو دیکھتے ہی بولی۔ "اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ میں تمہیں اس قیدی کے بارے میں بتاتی رہی ہوں تو میری بھی شامت آ جائے گی۔ پولیس اسپتال کے تمام اسٹاف کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسپتال کے اندر کے کسی آدمی نے اس نقلی نرس اور ڈاکٹر کی مدد کی تھی۔"

"ان کا پتہ نہیں چلا کہ وہ کون تھے؟" سنینا نے پوچھا۔

"نہیں۔" نرس نے جواب دیا۔ "پولیس چوکیداروں سے بھی پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ ان سے اسپتال کے تمام ڈاکٹروں اور نرسوں کی شناخت بھی کرائی جا رہی ہے لیکن وہ کسی کو نہیں پہچان سکے۔ نرسیں اور ڈاکٹر پولیس کے اس طرز عمل پر احتجاج کر رہے ہیں۔ انہوں

نے دھمکی دی ہے کہ اگر یہ سلسلہ بند نہ کیا گیا تو کل دوپہر بارہ بجے سارا اسٹاف ہڑتال کر دے گا۔"

"اور اس ڈاکٹر اور نرس کا کیا حال ہے جنہیں باندھ کر ڈال دیا گیا تھا؟" سنینا نے پوچھا۔

"نرس تو بہت خوفزدہ ہے۔ اس نے چھٹی لے لی ہے۔ البتہ ڈاکٹر رضوان اس وقت بھی اسپتال میں موجود ہے۔ ہمارا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ ہمیں تحفظ فراہم کیا جائے اور بیمار قیدیوں کے علاج کے لئے الگ اسپتال تعمیر کیا جائے۔" نرس نے بتایا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "کچھ دیر بعد وزارت صحت کا ایک نمائندہ یہاں آنے والا ہے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک نمائندہ ٹیم اسے اپنے مطالبات پیش کرے گی اور اس ٹیم میں' میں بھی شامل ہوں۔"

سنینا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ "سسٹر مدیحہ۔"

نرس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ سنینا بھی غیر ارادی طور پر اس طرف مڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک نوجوان ڈاکٹر ہاتھ میں ایک فائل پکڑے ان کی طرف آرہا تھا اور یہ وہی ڈاکٹر تھا جسے گزشتہ رات انہوں نے ڈیوٹی روم میں بے ہوش کر کے باندھ دیا تھا۔

سنینا کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی پیشانی پر بینڈیج لگی ہوئی تھی۔

"میں آپ کو تلاش کر رہا تھا سسٹر مدیحہ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہیلتھ منسٹری کے افسران آگئے ہیں۔ آپ میٹنگ روم میں چلئے میں ڈاکٹر عبداللہ اور مس زاہدہ کو لے کر آرہا ہوں۔" بات ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر نے سنینا کی طرف دیکھا۔

"یہ وارڈ میں داخل ایک مریض کی مسز ہیں۔" نرس نے سنینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے شوہر کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔"

"ہیلو....." ڈاکٹر سنینا کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کی نظریں سنینا کے چہرے پر تھیں۔

"ہے..... ہیلو....." سنینا کو اپنی آواز حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے

ایک لمحے کو یوں لگا جیسے اس کا دل اچھل کر سینے سے باہر آجائے گا۔

"آپ پانچ منٹ کے اندر اندر میٹنگ روم میں پہنچ جائیے مس مدیحہ۔" ڈاکٹر نے پیشانی پر لگی ہوئی بینڈیج کو الٹے ہاتھ کی انگلی سے ٹٹولتے ہوئے کہا اور گھوم کر دوسری طرف چلا گیا۔

سنینا اس وقت نرس کے ساتھ وارڈ کے سامنے والے برآمدے میں کھڑی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگالی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ خطرہ اسے اپنی ایک ہلکی سے جھلک دکھا کر نکل گیا تھا۔

گزشتہ رات سنینا اور بشارت مکمل تیاری کر کے اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ بشارت بھی ڈاکٹر کے گون میں تھا اور سنینا نے بھی نرس کا پورا ڈریس پہن رکھا تھا۔ سر پر کیپ اور آنکھوں پر سنہری فریم والی عینک بھی تھی۔ جب وہ ڈیوٹی روم میں داخل ہوئی تھی تو وہاں بیٹھا ہوا یہ ڈاکٹر رضوان اسے نرس ہی سمجھا تھا اور پھر بشارت نے کمرے میں داخل ہو کر اسے گرفت میں لے لیا تھا۔ ڈاکٹر رضوان کی پیشانی پر چوٹ بشارت سے ہاتھا پائی کے دوران میں ہی لگی تھی۔

اور اب ڈاکٹر رضوان نے اسے عام گھریلو لباس میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر عینک بھی نہیں تھی اور بال بھی کھلے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر رضوان اسے یقیناً نہیں پہچان سکا تھا لیکن اگر پہچان لیتا تو..... وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

نرس مدیحہ اس سے معذرت کر کے چلی گئی۔ سنینا کچھ دیر وہیں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی رہی پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے لان کی طرف چلنے لگی۔ بشارت سامنے ہی درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ سنینا قریب پہنچی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر بشارت چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا ہوا..... بدحواس کیوں ہو رہی ہو؟" بشارت نے پوچھا۔ اس کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی۔

"اس آدمی کو دیکھا تھا تم نے جو ہمارے پاس آکر کھڑا ہوا تھا؟" سنینا نے کہا۔

"ہاں۔ کون تھا وہ؟" بشارت نے پوچھا۔

"وہی ڈاکٹر جسے کل رات ڈیوٹی روم میں بے ہوش کر کے باندھا تھا۔" سنینا نے جواب دیا۔ "نرسوں اور ڈاکٹروں پر مشتمل ایک کمیٹی آج وزارت صحت کے ایک آفیسر کو اپنے

مطالبات پیش کرنے والی ہے۔ نرس مدیحہ بھی اس کمیٹی میں شامل ہے اور وہ ڈاکٹر رضوان' نرس کو بتانے آیا تھا کہ وہ میٹنگ روم میں پہنچ جائے۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر میرا تو سانس رکنے لگا تھا اور جب وہ میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا میں سمجھ رہی تھی کہ اب وہ میرا گریبان پکڑے گا لیکن....."

"لیکن وہ تمہیں نہیں پہچان سکا۔" بشارت نے مسکراتے ہوئے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ "میں نے کہا تھا نا تمہیں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔ لباس شخصیت بدل دیتا ہے تم بھی اس وقت بہت بدلی ہوئی ہو۔ نرس کے ڈریس میں تم کچھ اور تھیں اور اس لباس میں کچھ اور لگ رہی ہو۔ ویسے نرس نے کیا بتایا؟"

"پہلے یہاں سے نکلو.....بعد میں بتاؤں گی۔" سنینا نے کہا۔

بشارت کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ سنینا اب تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ کہاں تو اتنی جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کہ دو مرتبہ اسے پولیس سے بچا کر لے گئی تھی اور تیسری مرتبہ گزشتہ رات' اپنے آپ کو ایک بار پھر موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا اور کہاں یہ کہ کسی معمولی سی بات سے اس طرح خوفزدہ ہو جاتی تھی کہ وہ تھر تھر کانپنے لگتی تھی اور منہ سے آواز تک نہیں نکلتی تھی۔

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ گیٹ سے باہر نکل کر وہ کار میں بیٹھ گئے۔

"اب کہاں چلنا ہے؟" سنینا نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے گھر۔" بشارت نے کہا۔ "تم اپنی ضروری چیزیں بھی لے لو اور صبح وہ رقم بھی لینی ہے۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ سنینا کے گھر پہنچ گئے۔

سنینا اپنے کپڑے اور کچھ اور ضروری چیزیں سمیٹنے لگی۔ اس نے بشارت کے کپڑے بھی سمیٹ لئے تھے۔ بشارت نے وہ بریف کیس بھی الماری سے نکال لیا جس میں رقم بھری ہوئی تھی۔

وہ تقریباً ایک گھنٹہ مکان میں رہے تھے اور جب باہر نکل رہے تھے تو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ سنینا نے فون کی طرف بڑھنا چاہا مگر بشارت نے اسے روک لیا۔

"اس وقت کوئی کال ریسیو کرنے کی ضرورت نہیں کسی قسم کی الجھن بھی پیدا ہو سکتی

ہے۔"

سنینا سر جھٹک کر رہ گئی۔ اس نے سوٹ کیس کار کی ڈکی میں رکھ دیا۔ بریف کیس بشارت نے پسنجر سیٹ کے سامنے پیروں میں رکھ لیا تھا۔

وہ شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے ملتان روڈ کی طرف سے علامہ اقبال ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ کچھ آگے جا کر بشارت کو اسے راستہ بتانا پڑا کہ کس طرف جانا ہے۔ یہاں تک آتے ہوئے بشارت نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ ان کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ شکرا اپنے بیڈ پر کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ بشارت نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔

"اسپتال میں تو تمہیں وقت پر دوا ملتی تھی' دیکھ بھال بھی ہوتی تھی لیکن یہاں وہ بات نہیں ہے۔ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی؟"

"اسپتال میں بھی دوائیں تو عام سی دی جاتی تھیں۔ البتہ دن میں ایک بار پٹی ضرور بدل دی جاتی تھی۔ ویسے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔" شکرے نے کہا۔

دس بجے کے قریب بشارت' سنینا کو ساتھ لے کر ایک بار پھر کوٹھی سے نکل گیا۔ اس مرتبہ ان کی منزل اچھرے کی ایک گنجان آباد گلی ثابت ہوئی۔ بشارت نے کار گلی کے موڑ پر ہی رکوا دی تھی۔ اس نے سنینا کو انتظار کرنے کو کہا اور کار سے اتر کر گلی میں چلتا چلا گیا۔

گلی کافی کشادہ تھی۔ مکان بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اندر کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی اوپر والی کھڑکی سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔

"کیا بات ہے کس سے ملنا ہے جی؟"

"ماسی ارشاد بی بی سے ملنا ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔

دو منٹ بعد ہی دروازہ کھلا اور ایک عورت برآمد ہوئی۔ اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہو گی۔ بال برف کی طرح سفید تھے مگر صحت قابل رشک تھی۔

"اوہ.....تم ہو۔ مگر اس وقت۔"

"زیادہ دیر نہیں لگے گی ماسی' میرے پاس گاڑی ہے۔ میں تمہیں واپس یہاں پہنچا دوں

گا۔" بشارت نے کہا۔

"اچھا رکو۔ میں ابھی آتی ہوں۔ ہاں..... کیا بتایا تھا تم نے..... وہ زخمی ہے یا کوئی..... تکلیف بھی ہے۔" ماسی ارشاد بی بی نے کہا۔

"زخمی ہے اور زخم بڑی حد تک ٹھیک ہو چکے ہیں۔ تمہیں بس ڈریسنگ تبدیل کرنی ہو گی۔" بشارت نے کہا۔

ماسی ارشاد بی بی اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا ایک بیگ اٹھا رکھا تھا جو بشارت نے لے لیا۔

بشارت نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور بیگ بھی اندر رکھ دیا۔ وہ خود آگے بیٹھ گیا تھا۔

بازار کی طرف مڑتے ہی ماسی ارشاد بی بی نے ایک جگہ کار رکوالی۔ "کچھ دوائیں وغیرہ لینی ہیں۔ پیسے دو۔ میں خود لے کر آتی ہوں۔" ماسی ارشاد بی بی نے کہا۔

بشارت نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دے دیا۔ ماسی ارشاد بی بی کار سے اتر کر کچھ آگے ایک میڈیکل سٹور میں داخل ہو گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ پلاسٹک کی ایک تھیلی میں ڈریسنگ رول اور کاٹن رول بھی تھے۔

اچھرے سے آگے کا علاقہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹیں بھی نہیں تھیں۔ بشارت نے جیب سے سیاہ کپڑے کی ایک چوڑی پٹی نکالی اور مڑ کر ماسی ارشاد بی بی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "برا مت ماننا ماسی۔ مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہ پٹی آنکھوں پر باندھ لو۔"

ماسی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کپڑا اس سے لے کر پٹی کی طرح آنکھوں پر باندھ لیا اور بشارت کے حکم پر سیٹ پر نیم دراز ہو گئی۔

ماسی ارشاد بی بی ایک تربیت یافتہ نرس تھی۔ سرکاری اسپتال میں اس کی بیس سال کی سروس تھی۔ اسے بہت شریف عورت سمجھا جاتا تھا لیکن پھر اس نے ایسی حرکتیں شروع کر دیں جو نہ صرف قابل اعتراض بلکہ غیر قانونی تھیں اور ایک مرتبہ تو وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی جس وجہ سے اسے نہ صرف بیس سالہ پرانی سروس سے ہاتھ دھونے پڑے تھے بلکہ تین مہینے کی سزا بھی کاٹنی پڑی تھی۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد کچھ عرصہ تو وہ دبکی رہی پھر ایک پرائیویٹ کلینک پر نوکری کر لی لیکن چند مہینوں بعد ہی ڈاکٹر کو پتہ چل گیا کہ وہ غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔

ماسی ارشاد بی بی ایسی عورتوں کے لئے نجات دہندہ تھی جو کسی چکر میں پھنس کر اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کر لیتی تھیں۔ ماسی بھاری معاوضہ لے کر انہیں پیٹ میں پلنے والے گناہ سے نجات دلا دیتی تھی۔

اس ڈاکٹر کو پتہ چل گیا کہ ماسی ارشاد بی بی نے یہاں بھی یہ دھندہ شروع کر دیا تھا لہٰذا اس نے فوراً ہی اسے چلتا کر دیا۔

ماسی ارشاد بی بی اب یہ دھندہ گھر پر ہی کرتی تھی۔ لوگ بھاری معاوضہ دے کر اس کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ بشارت کو اس کے بارے میں تین چار مہینے پہلے پتہ چلا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے یہاں آیا کرتا تھا۔ اس روز وہ سڑک کے موڑ پر کھڑے تھے اور ماسی کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر دوست نے بشارت کو اس کے بارے میں بتایا تھا۔

اور پھر اسی روز شکرے کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لئے منصوبہ بناتے وقت بشارت کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ بعد میں بشارت کو علاج کی ضرورت ہو گی اور اسی وقت ماسی ارشاد بی بی کا نام اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ ماسی ارشاد بی بی بیس سال اسپتال میں سروس کر چکی تھی۔ اس نے ہر قسم کے مریضوں کو دیکھا ہو گا۔ اتنی پرانی نرسیں تو ڈاکٹر سے بھی زیادہ تجربہ کار ہوتی ہیں اور پھر شکرے کا کیس زیادہ پیچیدہ نہیں تھا۔ بشارت نے اس روز ماسی ارشاد سے رابطہ کر کے آمادہ کر لیا تھا اور دو ہزار روپے ایڈوانس بھی دے دیئے تھے۔

کار گیٹ میں داخل ہونے کے بعد بشارت نے ماسی ارشاد بی بی کو ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اتارا اور کمرے میں لے جانے کے بعد ہی اس کی آنکھ سے پٹی کھولی تھی۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں ملتی رہی پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بشارت اسے شکرے والے کمرے میں لے آیا۔ اس دوران میں سنیتا اس کا بیگ اور دواؤں والا تھیلا بھی لے آئی تھی۔ سنیتا کے خیال میں کاٹن کا رول اور دوائیں وغیرہ زیادہ سے زیادہ سو روپے کی آئی ہوں گی مگر ماسی نے پانچ سو کے نوٹ سے باقی رقم واپس نہیں کی تھی۔

ماسی ارشاد بی بی نے شکرے کے جسم پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی اور پھر اس کی پشت پر

تین زخم دیکھتے ہی چونک گئی۔ زخم بھر گئے تھے۔ ان کے اطراف کی جلد گلابی مائل تھی۔ وہ گہری نظروں سے ان زخموں کا جائزہ لے رہی تھی۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا بندہ آپس کی لڑائی سے زخمی ہو گیا ہے لیکن یہ..... یہ تو پولیس کیس ہے۔" وہ بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہارا ہر کیس ویسے بھی پولیس کیس ہی ہوتا ہے۔" بشارت نے اسے گھورا۔ "اس لئے بھول جاؤ یہ کون سا کیس ہے۔ تمہیں اس کا علاج کرنا ہے اور راز داری کے لئے ہی تمہیں اتنی زیادہ رقم دی جا رہی ہے۔"

"یہ وہی لڑکا ہے جسے کل اسپتال سے فرار کرایا گیا تھا اور تم لوگ....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا۔ بشارت اس کی بات سن کر چونک گیا۔

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا تھا کہ اسے اسپتال سے فرار کرایا گیا ہے۔" بشارت نے اسے گھورا۔

"آج اخباروں میں اس کے بارے میں سب کچھ چھپ چکا ہے۔ اگر اس کی تصویر نہیں چھپی تو کیا ہوا۔ اس کے زخم بتا رہے ہیں کہ یہ اسپتال میں زیر علاج تھا اور آج تمام پرائیویٹ اسپتالوں اور کلینکوں کے لئے یہ وارننگ بھی چھپی ہے کہ یہ شخص علاج کے لئے ان کے پاس آئے تو فوری طور پر پولیس سے رابطہ کیا جائے۔ بصورت دیگر....."

"بکو۔" بشارت نے اسے ٹوک دیا۔ "تم نہ تو پرائیویٹ اسپتال کھولے بیٹھی ہو اور نہ کلینک۔ میں اسی لئے تمہارے پاس آیا تھا۔ تم شاید بھول رہی ہو کہ دو مہینے بعد تمہیں اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے اور تمہیں پیسے کی ضرورت ہے۔ محکمہ بہبود آبادی والوں کی وجہ سے ویسے بھی تمہارا دوسرا دھندہ ٹھپ ہو چکا ہے۔ آج کل تو ویسے بھی گلی محلے کی ہر دکان پر ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن کے استعمال سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں کوئی ڈر خوف نہیں رہتا۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے پتر۔ اگر پولیس کو پتہ چل گیا تو اس بڑھاپے میں جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔" ماسی ارشاد بی بی نے کہا۔

"جیل تمہارے لئے نئی تو نہیں ہے ماسی۔" بشارت نے اس کے چہرے پہ نظریں جما دیں۔ "کچھ عرصے پہلے ہی تو تین مہینے گزار کر آئی ہو لیکن اطمینان رکھو۔ ہماری طرف سے

ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم ہمارا راز رکھو۔ ہم تمہارا راز رکھیں گے۔ اس میں زیادہ فائدہ تمہارا ہی ہے۔ اب تم مریض پر توجہ دو۔"

ماسی ارشاد کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ شخص اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ خاموشی سے جھک کر شکرے کے زخموں کا معائنہ کرنے لگی۔ اس نے شکرے سے کچھ سوالات بھی کئے پھر بیگ میں سے ایک ٹیوب نکال کر مرہم اس کے زخموں پر لگانے لگی۔ ڈریسنگ کرنے کے بعد اس نے باتھ روم میں جا کر ہاتھ دھوئے اور پھر تھیلے میں سے ڈسپوزیبل سرنج اور ایک انجکشن نکال لیا۔ شکرے کو ایسے انجکشن اسپتال میں بھی لگ چکے تھے۔ ماسی نے اس کے بازو کے مسل میں سوئی چبھوئی تو اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ بڑا سخت ہاتھ تھا کم بخت کا۔

"میں انجکشن اور گولیاں لے آئی تھی۔ انجکشن لگا دیا ہے یہ گولیاں دن میں تین ٹائم دیتے رہنا۔ زخم خشک ہو جائیں گے اور دو تین دن بعد ڈریسنگ کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ چند روز تک یہ مرہم لگا دینا ہی کافی ہو گا۔" ماسی نے کہا اور تھیلے میں سے گولیوں کا ایک پتا میز پر الگ رکھ دیا۔ اس نے پلاسٹک کا تھیلا بھی میز پر ہی رہنے دیا تھا۔

بشارت نے جیب سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ ماسی نے وہیں کھڑے کھڑے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پرس نکالا۔ نوٹ تہہ کر کے اس میں رکھے اور پرس کو دوبارہ گریبان میں ٹھونس لیا۔ بشارت نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آیا۔

تین دن تک وہ ماسی ارشاد بی بی کو اسی طرح لاتے اور واپس چھوڑتے رہے۔ چوتھے روز سنیتا اور بشارت حسب معمول رات ساڑھے دس بجے ماسی ارشاد بیگم کو لینے کے لئے پہنچ گئے۔ کار گلی کے موڑ پر دور ہی روک لی گئی۔ بشارت کار سے اتر کر جیسے ہی گلی میں مڑا ٹھٹک کر رک گیا۔ گلی میں بہت سے لوگ جمع تھے اور ماسی ارشاد بی بی کے گھر کے سامنے پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ ایک مسلح پولیس والا بھی جیپ کے قریب مکان کے دروازے کے سامنے والے تھڑے پر کھڑا تھا۔

بشارت واپس مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جلدی نکلو یہاں سے۔"

"کیا ہوا؟" سنیتا نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ ایک دم بدحواس سی ہو گئی تھی۔

"ماسی ارشاد بی بی کے گھر پر پولیس نے ریڈ کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے لئے ماسی میپتے بن جائے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔" بشارت نے کہا۔

سنیتا کار کو حرکت میں لے آئی اور پھر گلیوں سے نکلتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ بشارت بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔

"پولیس کس چکر میں آئی ہو گی؟" سنیتا نے خالی پلاٹوں کے بیچ ایک تنگ سی سڑک پر کار موڑتے ہوئے پوچھا۔

"عورتوں کے پیٹ میں پلنے والے گناہوں سے نجات دلانے کے حوالے سے ماسی ارشاد بی بی خاصی بدنام ہے۔ ویسے تو پولیس ایسے لوگوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی کیس بگڑ گیا ہو' معاملہ سنگین ہو گیا ہو۔ پولیس والے پوچھ گچھ کے لئے آئے ہوں گے۔ لوگوں کو تو ایسے مواقع کی تلاش رہتی ہے نا۔ اس کے گھر کے سامنے میلہ لگا ہوا تھا۔" بشارت نے کہا۔

وہ ماسی ارشاد بی بی کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہوئے کوٹھی پہنچ گئے۔ بشارت جب ماسی ارشاد بی بی کے بغیر کمرے میں داخل ہوا تو شکرے کو کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"ماسی کے گھر پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔" بشارت نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا اور سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تو پولیس کو پتہ چل گیا کہ وہ مفرور قیدی کا علاج کر رہی تھی۔" شکرے نے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"ضروری نہیں کہ یہی وجہ ہو۔" بشارت نے جواب دیا۔ "کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ بہرحال' تمہارے علاج کا یہ ایک سلسلہ جو چلا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب کسی اور کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

"میرے خیال میں اب مجھے کسی کے علاج کی ضرورت نہیں ہے۔" شکرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "زخم سوکھ رہے ہیں صرف مرہم ہی تو لگانی ہوتی

ہے۔ وہ تم بھی لگا سکتے ہو اور گولیاں تو میں ویسے ہی کھا رہا ہوں۔ ختم ہو جائیں گی تو اور لے آئیں گے۔"

"ہاں' اب تو مجبوری ہے۔" بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس دوران میں سنیتا بھی وہاں آ گئی اور وہ دیر تک ماسی ارشاد کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

"تمہیں اس عورت کے بارے میں کیسے پتہ چلا تھا کہ یہ اس قسم کے دھندے کرتی ہے؟" شکرے نے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یاد ہے تین چار مہینے پہلے میں اچھرے جایا کرتا تھا۔ مقصود سے ملنے کے لئے۔" بشارت نے جواب دیا۔ "ایک دن ہم موڑ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ ماسی ہمارے قریب سے گزری۔ مقصود نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت تو ظاہر ہے میں نے کوئی توجہ نہیں دی مگر اب کام آ گئی۔"

"ہوں۔" شکرے نے ہنکارا بھرا۔ "یہ ماسی میپتے اسپتال کی دوائیاں چوری کر کے بیچتی تھی اور اسپتال میں بھی عورتوں کا غیر قانونی دھندہ کرتی تھی اسی لئے اسے نوکری سے نکال دیا گیا اور تین مہینے کی سزا بھی ہو گئی۔ یہی بتایا ہے نا تم نے!"

"ہاں..... کچھ ایسی ہی بات تھی۔" بشارت نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بات یہ ہے بشارت باؤ۔" شکرا پر سوچ انداز میں بولا۔ "پولیس ایسے لوگوں کو نگاہ میں رکھتی ہے۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو تو ایسے لوگوں کو بھی چیک کیا جاتا ہے۔ ماسی ارشاد بی بی چونکہ پہلے ہی سے غیر قانونی دھندے کرتی ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے پولیس کو اس پر شبہ ہوا ہو اور اسے پوچھ گچھ کے لئے پکڑ کر لے گئی ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں ماسی ارشاد بی بی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا کرتا تھا۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ اسے کہاں لے جایا جاتا تھا۔ وہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔"

"یہاں تم ایک بہت بڑی غلطی کر رہے ہو بشارت۔" شکرے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری گڈی..... ہو سکتا ہے اس ماسی میپتے نے گڈی کا نمبر یاد رکھا ہو اور پولیس کو وہ نمبر بتا دے۔"

"ہاں یہ بات سوچنے کی ہے۔" بشارت کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ "یہ بات

میرے ذہن میں نہیں رہی تھی۔ بہرحال اس سلسلے میں ہمیں محتاط رہنا پڑے گا۔"

رات کا ایک بج گیا۔ سنیتا جماہیاں لے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے اپنا بیڈ بشارت والے کمرے میں ہی لگا رکھا تھا اور وہ وہیں سوتی تھی۔ سنیتا کے جانے کے بعد بھی بشارت دیر تک بیٹھا شکرے سے باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ سنیتا سو چکی تھی۔ بشارت چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ بار بار سنیتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سنیتا نے اسے بڑی کڑی آزمائش میں ڈال رکھا تھا۔ بعض اوقات تو اس کے سینے میں آگ سی بھڑک اٹھتی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا رکھا تھا۔

☆=====☆=====☆

بشارت کو یاد نہیں وہ کب سویا تھا۔ صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ سنیتا کا بستر خالی تھا۔ باتھ روم کے شاور سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر شکرے کے کمرے میں آگیا۔ شکرا سو رہا تھا۔ بشارت دوبارہ اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

تقریباً دس منٹ بعد باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سنیتا نے پہلے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ وہ بشارت کو سوتا ہوا سمجھ کر باتھ روم سے باہر آگئی اور دبے قدموں چلتے ہوئے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا۔ اس نے جسم پر بڑا تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے بالوں سے پانی نچڑ رہا تھا اور بدن پر بھی پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔

بشارت کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی اور پھر اس کے منہ سے اسی طرح سانس نکلا جیسے غبارے سے اچانک ہی ہوا نکلی ہو۔

سنیتا نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بشارت پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھری ہوئی تھی۔ سنیتا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی بیڈ کے قریب آگئی اور پھر آہستہ آہستہ بشارت پر جھکنے لگی۔

بشارت کی رگوں میں خون اچھل رہا تھا۔ تپش سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کا سانس

دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور اس سے پہلے کہ کوئی پیش رفت ہوتی' دروازے کے باہر چپل گھسٹ کر چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔ سنیتا ایک جھٹکے سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے اپنے کپڑے اٹھائے اور دوڑ کر باتھ روم میں گھس گئی۔

بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ شکرا تھا جو اپنے کمرے سے نکل کر باہر کچن کی طرف جا رہا تھا۔ ٹانگ پر گولی لگنے کی وجہ سے وہ پیر گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے مڑ کر بشارت کی طرف دیکھا۔

"پیاس لگ رہی تھی یار۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "میں نے سوچا تمہیں آواز دینے کے بجائے خود ہی اٹھ کر پانی پی لوں۔"

"میں پلاتا ہوں۔" بشارت کہتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ ایک گلاس شکرے کو دیا اور بوتل اپنے ہونٹوں سے لگا لی۔ ٹھنڈے پانی کے کئی گھونٹ حلق میں انڈیلنے کے بعد اس کے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔ وہ شکرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا کہیں وہ اس کے چہرے کو دیکھ کر اصل بات نہ سمجھ جائے۔

وہ دونوں ہال میں صوفے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد سنیتا بھی آگئی اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

اور پھر وہ چائے پی رہے تھے کہ باہر کا گیٹ زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ بشارت اچھل پڑا۔ ان تینوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"میں دیکھتی ہوں۔" سنیتا کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

بشارت بھی اٹھ کر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے شکرے کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ سنیتا نے پہلے برآمدے میں آکر پوچھا کہ کون ہے۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ آگے بڑھ گئی اور گیٹ کی جھری سے باہر جھانکنے لگی۔ پھر اس نے ذیلی دروازہ کھول دیا اور گردن ڈال کر دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا تھا۔ گیٹ کے دائیں طرف ایک عورت کھڑی تھی۔

اس کی عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ پھولدار چھینٹ کی قمیص، کالی شلوار اور سر پر میلی سی چادر تھی۔ پیروں میں پرانے سے سینڈل تھے۔

وہ جوان تھی، رنگ گورا تھا اور چہرے کے نقوش بھی دلکش تھے مگر لباس سے وہ گھروں میں کام کرنے والی ماسی قسم کی عورت لگتی تھی۔

"کیا بات ہے۔ کون ہو تم.....؟" سنیتا نے اسے گھورا۔

"بی بی کوئی کام دے دو۔" اس عورت نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں ہے کوئی کام وام..... بھاگ یہاں سے۔" سنیتا جھنجلا گئی۔

"کچھ بچا کھچا کھانے کو ہی دے دو۔ میرے بچے بھوکے ہیں بی بی۔"

سنیتا نے ایک بار پھر اسے گھورا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ واپس مڑتے ہوئے اس کی نظر رول کئے ہوئے اخبار پر پڑ گئی۔ یہاں آنے کے دوسرے روز بشارت نے بک اسٹال والے کو کوٹھی کا پتہ بتا کر اخبار ڈالنے کو کہہ دیا تھا اور ہاکر روزانہ اخبار پھینک جاتا تھا۔ سنیتا نے اخبار اٹھالیا اور اس پر سے ربر بینڈ اتارتے ہوئے اندر آگئی۔

"کون تھا؟" بشارت نے دروازے کی آڑ سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی عورت تھی۔ کام مانگ رہی تھی۔" سنیتا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جھگیوں میں رہنے والی یہ عورتیں کام کی تلاش میں گھروں میں پھرتی رہتی ہیں۔ ان کے مرد نشہ کرنے اور جوا کھیلنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ کوٹھیوں میں چوریوں اور ڈکیتیوں میں بھی انہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔"

اس نے اخبار کھول کر اپنے سامنے پھیلا لیا اور سرخیوں پر نگاہ دوڑانے لگی۔ وہ خبر آخری صفحے پر تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ سنیتا ماسی ارشاد بی بی کے مکان پر پولیس کے چھاپے کی خبر بڑھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ اس نے اخبار بشارت کی طرف بڑھا دیا۔ بشارت نے بھی وہ خبر پڑھی۔

پولیس بڑی سرگرمی سے اسپتال سے فرار ہونے والے زخمی قیدی اور اس کے دو ساتھیوں کو تلاش کر رہی تھی۔ پولیس کو شبہ تھا کہ اس واقعے میں اسپتال کا کوئی ملازم بھی ملوث ہو سکتا ہے کیونکہ اندرونی امداد کے بغیر باہر کا کوئی آدمی اس قسم کے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تحقیقات کے دوران میں یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ دو سال پہلے ارشاد بی بی نامی

ایک نرس کو اسپتال کی سرکاری دوائیں بیچنے اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونے پر ملازمت سے نکال دیا گیا تھا اور اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی گئی تھی۔ اسے تین ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ زخمی قیدی کے فرار سے ایک روز پہلے ارشاد بی بی کو اسپتال میں دیکھا گیا تھا۔ پولیس کو یہ بھی شبہ تھا کہ اسپتال کے خلاف انتقامی کارروائی کے خیال سے ماسی ارشاد اس معاملے میں ملوث ہو سکتی ہے۔ اگر زخمی قیدی کو فرار کرانے میں اس کا ہاتھ ہوا تو وہ قیدی کو علاج کی سہولت بھی فراہم کر سکتی ہے۔

پولیس نے گزشتہ رات چھاپہ مار کر ارشاد بی بی کو حراست میں لے لیا۔ پوچھ گچھ کے دوران میں اس نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ایک عورت اور ایک مرد اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مکان پر لے جاتے تھے جہاں وہ تین دن تک قیدی کے زخموں کی ڈریسنگ کرتی رہی۔

ماسی ارشاد بی بی پولیس کو ان کے بارے میں زیادہ تفصیل سے نہیں بتا سکی تھی۔ البتہ اس نے سرخ شیراڈ کا نمبر بتا دیا تھا جس پر اسے لے جایا جاتا تھا۔

"ماسی ارشاد بی بی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لائے جانے والی حکمت عملی کام آگئی۔" بشارت نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کم بخت نے پولیس کو گاڑی کا نمبر بتا دیا ہے اور پولیس اس نمبر کے ذریعے....."

"ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔" سنیتا نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "یہ گاڑی میں نے دو سال پہلے مغل پورہ میں شالیمار لنک روڈ سے نیلامی میں خریدی تھی۔ وہاں ہر جمعے کو موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا بازار لگتا ہے۔ گاڑی خریدنے کے بعد اسے میں نے اپنے نام ٹرانسفر بھی نہیں کروایا۔ ویسے میں اس گاڑی کی چوتھی خریدار ہوں۔ پولیس رجسٹریشن نمبر کے ذریعے اصل مالک تک پہنچے گی اور وہ بھی نہیں بتا سکے گا کہ یہ گاڑی اب کس کے پاس ہے۔"

"لیکن....." بشارت اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ گاڑی اب ہم استعمال نہیں کر سکتے۔ پولیس نے اس کی تلاش میں جگہ جگہ چیکنگ شروع کر دی ہوگی اور اگر اس کار کا نمبر اخبار میں چھپوا دیا گیا تو تمہارے محلے کا کوئی آدمی پولیس کو بتا سکتا ہے کہ یہ کار تمہارے پاس ہے اور تمہاری وہ دوست شبنم۔" بشارت نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "وہ تو

یقیناً جانتی ہو گی یہ تمہاری گاڑی ہے۔"

"تو پھر ہمیں یہ دعا کرنی چاہئے کہ پولیس اخبارات کو اس کار کا نمبر جاری نہ کرے۔" شکرے نے پہلی مرتبہ ان کی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... اب یہی دعا مانگی جا سکتی ہے۔" بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

اس کوٹھی کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ظاہر ہے وہ گھر میں قید ہو کر بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس شام سنیتا اور بشارت کوٹھی کی چھت پر آ گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بشارت کی نظریں تقریباً پچاس گز دور ایک خالی پلاٹ پر بنی ہوئی جھگیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ چار پانچ جھگیاں تھیں۔ جب وہ لوگ اس کوٹھی میں آئے تھے تو یہ جھگیاں نہیں تھیں۔ یہ ڈیرہ غالباً کل ہی کسی وقت بنا تھا۔

"صبح وہ عورت کام کی تلاش میں آئی تھی۔" سنیتا نے جھگیوں کے سامنے کالی شلوار والی ایک عورت کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ لوگ اچھے ہیں۔" بشارت نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "جہاں چاہا گھر بسایا اور جب چاہا سامان کندھوں پر لاد کر چل دیئے۔"

وہ کچھ دیر تک چھت پر کھلی ہوا میں کھڑے رہے پھر نیچے آ گئے۔

اس رات بشارت کو نیند نہیں آ سکی تھی۔ وہ بار بار سنیتا کی طرف دیکھتا جو گہری نیند سو رہی تھی۔ بشارت کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئی تھیں لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اپنا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کیا بننا چاہتا تھا کیا بن گیا۔ اس گندگی کی دلدل میں گردن تک دھنس گیا تھا اور اب اسے واپسی کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

بات کئی سال پہلے میلے میں نجمہ کے اغوا سے شروع ہوئی تھی۔ جیل سے رہائی پانے کے بعد پہلے وہ جیب کترا بنا اور اب قاتل بن گیا تھا۔ اس دوران میں وہ ایک لمحے کو بھی نجمہ کو نہیں بھولا تھا۔ وہ اسے مسلسل تلاش کرتا رہا لیکن اس کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔

بشارت کا دماغ سلگ رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا اور برآمدے کے سامنے صحن میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ رات گزرتی رہی اور وہ کرسی پر بیٹھا تاریک آسمان کو گھورتا رہا۔

☆======☆=====☆

وہ پولیس آفیسر تھا جو شبانہ سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑا اسے گھور رہا تھا اور شبانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ جسم کا کوئی حصہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑی خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"کون ہو تم؟" پولیس آفیسر کی کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "کوٹھی کے اندر کیسے داخل ہوئیں۔ کہاں سے آئی ہو؟"

شبانہ کی زبان گنگ ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا مگر حلق خشک ہو گیا تھا۔ زبان کانٹے کی طرح سوکھ کر تالو میں چبھ رہی تھی۔

"اٹھو!" آفیسر کی آواز دوبارہ سنائی دی تھی۔ "میں نے پوچھا تھا کون ہو تم..... اور کوٹھی کے اندر کیسے داخل ہوئی تھیں؟"

شبانہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"مم..... میں..... وہ دیوار پھاند کر اندر آئی تھی۔" اس نے ہکلاتے ہوئے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ "رات کو غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ مم..... میں ان سے بچنے کے لئے یہاں چھپ گئی تھی۔ پپ..... پانی..... تھوڑا پانی....."

پولیس آفیسر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب کرختگی کے تاثرات نہیں رہے تھے۔ شبانہ کے لباس اور شکل و صورت سے اسے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ واقعی کوئی مظلوم لڑکی ہے اور اس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے۔

"ڈرو نہیں۔" اس مرتبہ اس کے لہجے میں کرختگی کے بجائے ہمدردی تھی۔ "آؤ..... اندر آ جاؤ.....! تم شاید رات بھر یہاں پڑی رہی ہو۔"

شبانہ خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اب تک جو بھی ملا تھا ہمدرد بن کر ہی ملا تھا۔ اصلیت تو بعد میں کھلتی تھی کہ ہمدردی کا اظہار کیوں ہوتا تھا۔ اس کے سامنے کھڑا ہوا یہ پولیس آفیسر بھی اس سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔

"ڈرو نہیں۔" پولیس آفیسر نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہاں میں اکیلا نہیں ہوں۔ میری ماں ہے۔ بہن بھی ہے۔ تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اندر چل کر آرام سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ تم کون ہو اور وہ غنڈے کون تھے۔ شام سے پہلے پہلے انہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچادوں گا۔"

شبانہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کوٹھی کے برآمدے کی طرف سے ایک نسوانی آواز سن کر وہ چونک گئی۔

"تم ابھی تک دفتر نہیں گئے اشرف..... اور یہ کون ہے؟"

اس پولیس آفیسر کے ساتھ ہی شبانہ نے بھی مڑ کر اس طرف دیکھا۔ برآمدے میں ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ اس کے بال سفید اور عمر پچپن کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ جسم فربہ اور چہرے پر سرخی تھی۔

"یہ میری والدہ ہیں۔ آؤ..... ڈرو نہیں۔" پولیس آفیسر نے شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کہا۔

شبانہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ برآمدے کی طرف چل پڑی۔ اس کی ٹانگوں میں اب بھی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت نے آفیسر سے پوچھا۔

"پتہ نہیں ماں جی۔" اس نے جواب دیا۔ "وہاں گھاس پر سو رہی تھی۔ رات کو شاید غنڈے اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور یہ ان سے بچنے کے لئے دیوار پھاند کر کوٹھی میں گھس آئی تھی۔"

اس بوڑھی عورت نے گہری نظروں سے شبانہ کی طرف دیکھا اور پھر اسے اندر لے آئی۔ اسی وقت ایک جوان لڑکی بھی کسی کمرے سے نکل کر وہاں آگئی۔ پولیس آفیسر اشرف نے اسے اشارہ کیا اور وہ پانی کا گلاس لے آئی۔

شبانہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور خوفزدہ سی نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں بیٹی۔" بوڑھی عورت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم محفوظ جگہ پر ہو۔ میرا بیٹا اے ایس پی ہے۔ اسے بتاؤ وہ غنڈے کون تھے۔"

شبانہ نے اشرف کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دراز قامت، صحت مند جسم سرخ و سفید رنگت، پولیس کی وردی بھی اس کے جسم پر خوب جچ رہی تھی۔

شبانہ نے شاید زندگی میں پہلی بار کسی کے گھر آکر سکون محسوس کیا تھا۔ وہ فربہ اندام عورت بڑی پُروقار اور بردبار نظر آرہی تھی۔ اس کی بیٹی شبانہ کی ہم عمر تھی۔ اس کے چہرے سے بھی سنجیدگی ٹپک رہی تھی اور وہ پولیس آفیسر..... یوں تو قدم قدم پر شبانہ کے ساتھ دھوکا ہوا تھا وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھاگتی رہی تھی لیکن نہ جانے اسے یہ یقین کیوں ہو گیا تھا کہ یہاں اس کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ وہ واقعی صحیح ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

"کیا نام ہے بیٹی..... کہاں رہتی ہو تم؟" اس بردبار خاتون نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ماں جی۔" شبانہ کا لہجہ رو دینے والا تھا۔ "اور نام کیا بتاؤں آپ کو..... شبانہ، نگینہ، ردمانہ، نگہت یا کوئی اور؟ جس نام سے آپ چاہیں مجھے پکار لیں۔"

"کیا مطلب.....؟ میں سمجھی نہیں بیٹی۔" خاتون نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اے ایس پی اشرف بھی چونک گیا۔ وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ شبانہ کی یہ بات سن کر وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اپنا اصلی نام بتاؤ۔" وہ بولا۔ "وہ غنڈے کون تھے جو تمہارا پیچھا کر رہے تھے؟"

"تم رک جاؤ بیٹا۔" بڑی بی نے کہا۔ "میں اس سے پوچھتی ہوں، ذرا حواس پر تو قابو پانے دو۔ ڈری ہوئی ہے۔" وہ قریب کھڑی ہوئی اپنی بیٹی کی طرف گھوم گئی۔ "سلمٰی بیٹی۔ اسے باتھ روم لے جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنا حلیہ درست کرلے۔ اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ حواس بحال ہوں تو کچھ بتائے گی۔"

سلمٰی، شبانہ کو اپنے کمرے میں لے گئی اور غسل خانے کا دروازہ دکھا دیا۔ آدھے گھنٹے بعد شبانہ اس کمرے سے نکلی تو وہ بڑی حد تک اپنے قابو میں تھی۔ اے ایس پی اشرف اس وقت فون پر بات کر رہا تھا۔

"میں ذرا دیر سے آؤں گا۔" وہ فون پر کہہ رہا تھا۔ "ہاں۔ گھر پر ہی ہوں۔ کوئی خاص

بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔" اس نے فون بند کر دیا اور شبانہ کی طرف دیکھنے لگا جو ماں جی کے قریب صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

اس وقت نوکر نے شبانہ کے سامنے سینٹر ٹیبل پر ناشتہ لگا دیا۔

"ناشتہ کر لو بیٹی۔ آرام سے بیٹھو۔ بعد میں تم سے بات کریں گے۔" ماں جی نے کہا۔

شبانہ نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اس وقت اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔ اشرف اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

شبانہ جھجکتے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ ناشتہ کرتی رہی۔ ناشتے کے بعد ماں جی نے اس کے لئے اور اپنے لئے بھی چائے منگوالی۔

"ہاں بیٹی۔ اب بتاؤ تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو؟" ماں جی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تم نے کیا کہا تھا کہ تمہارا کوئی نام نہیں اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے؟"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ماں جی۔" شبانہ نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں افسردگی سی تھی۔ اس دوران میں اے ایس پی اشرف بھی اپنے کمرے سے نکل کر ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ "میں نے اتنے ٹھکانے بدلے ہیں ہر جگہ مجھے ایک نیا نام دیا گیا۔ میں تو اپنے آپ کو بھی بھولتی جا رہی ہوں۔"

"حوصلہ رکھو بیٹی۔" ماں جی نے اسے دلاسہ دیا۔ "شروع سے بتاؤ۔ تم کون ہو' کہاں کی رہنے والی ہو۔ تمہارا اصل نام کیا ہے اور تمہارے ماں باپ کہاں ہیں کوئی بہن بھائی.....؟"

"میرا نام نجمہ ہے۔ ماں باپ بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ ایک بھائی ہے مجھ سے تقریباً ڈیڑھ سال چھوٹا' لیکن وہ کہاں اور کس حال میں ہے' مجھے نہیں معلوم..... آخری مرتبہ وہ میلے میں میرے ساتھ تھا۔ جب مجھے غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے اور وہ مجھے چھڑانے کے لئے پیچھے دوڑا تھا لیکن اسے کچھ لوگوں نے پکڑ لیا تھا اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔" وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گئی اور پھر اپنی کہانی سنانے لگی۔

آخر میں وہ کہہ رہی تھی۔ "میں چار سال سیالکوٹ میں ایک زمیندار کے گھر میں رہی اور پھر ایک روز گھر کی ایک ملازمہ نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ مجھے بیچنے کا پروگرام بنا رہے ہیں چند روز بعد مجھے سرحد پار بیچ دیا جائے گا۔ اسی روز ملازمہ نے مجھے ایک رشتے دار کے ساتھ زمیندار

کے گھر سے بھگا دیا جو مجھے فیصل آباد لے گیا لیکن چند روز بعد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ ان لوگوں کی بھی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ایک رات ان کے گھر سے بھاگ نکلی۔ پولیس نے مجھے پکڑ کر ایک رفاہی ادارے میں بھیج دیا جہاں میری طرح اور بھی بہت سی بے سہارا بچیاں اور بچے موجود تھے۔

"میں نے ادارے کے منتظم کو اپنے بھائی کے بارے میں اور اپنے گھر کا پتہ بتایا اور بار بار ان سے درخواست کرتی رہی کہ یا تو میرے بھائی کو اطلاع دے دی جائے یا مجھے میرے گھر پہنچا دیا جائے لیکن مجھے تسلی دلاسے دے کر ٹرخایا جاتا رہا۔

"پانچ سال گزر گئے میں اپنے گھر جانے کے لئے اور اپنے بھائی سے ملنے کے لئے تڑپتی رہی لیکن وہ لوگ بڑے بے رحم ثابت ہوئے۔ نہ تو انہوں نے میرے بھائی کے بارے میں کچھ بتایا اور نہ ہی مجھے میرے گھر بھیجا۔

"میں جوان ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کی نظریں مجھے ٹٹولتی رہتی تھیں اور پھر ایک روز مجھے ایک بوڑھے کے ساتھ بھیج دیا گیا۔

"اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ پلکیں تک سفید ہو چکی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بوڑھے کی کوئی اولاد نہیں' اس کے پاس دولت کی کمی نہیں لیکن اس کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں۔ اسے ایک سہارے کی ضرورت ہے جو اس بڑھاپے میں اس کا خیال رکھے۔ وہ مجھے بیٹی بنا کر رکھے گا۔

"لیکن اسی رات یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ وہ بوڑھا مجھے بیٹی نہیں کچھ اور بنانے کے لئے لایا تھا۔ وہ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا مگر اس کی ہوس کم نہیں ہوئی تھی۔ اس رات اس نے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی ٹانگ توڑ دی۔

"اس بوڑھے کے ساتھ شاید پہلی مرتبہ ایسا سلوک ہوا تھا۔ پہلے تو وہ چیختا چلاتا رہا پھر معافی مانگنے لگا کہ آئندہ مجھے بری نظر سے نہیں دیکھے گا۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ مجھے اس رفاہی ادارے سے دو لاکھ روپے میں خرید کر لایا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی ایک لڑکی کو وہاں سے لا چکا تھا جس نے ایک ہفتے بعد ہی خودکشی کر لی تھی۔

"میں نے اس بڈھے کی ٹانگ توڑی تھی۔ پھر اس کی خدمت بھی خوب کی۔ تین مہینے وہاں رہی اور پھر ایک روز میں لاہور آ گئی۔ کئی سال بیت گئے تھے بہت کچھ بدل چکا تھا۔

ہمارے اس گھر کا نقشہ بھی بدلا ہوا تھا جہاں میں نے جنم لیا تھا اور جہاں میں نے اپنے ماں باپ کو افلاس کی حالت میں دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا لیکن یہ جان کر میرے دل پر گھونسہ سا لگا کہ اب وہ ہمارا گھر نہیں رہا تھا۔

"اس مکان میں رہنے والوں نے بتایا کہ کئی سال پہلے میرا بھائی بشارت بھی وہاں آیا تھا۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا کہ وہ سزا بھگت کر جیل سے نکلا تھا۔ میرا دل حلق سے رہ گیا لیکن مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ میرا بھائی زندہ ہے۔ میں ملک صاحب کے گھر آگئی جہاں میں بچپن میں کام کیا کرتی تھی۔

"ملکانی نے مجھے پہچان لیا۔ اس نے میری داستان بھی بڑی ہمدردی سے سنی لیکن اس نے مجھے اپنے گھر میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بیٹے جوان ہو چکے تھے اور وہ کسی غیر لڑکی کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

"میں اپنے بھائی کو تلاش کرتی رہی۔ چوہدری عمر کے پاس بھی گئی جس نے ہمارا مکان بیچا تھا۔ اس نے بتایا کہ بشارت کئی سال پہلے اس کے پاس آیا تھا اور دھمکی دے کر چلا گیا تھا۔ مجھے چوہدری عمر ہی نے بتایا کہ بشارت مجرمانہ زندگی اختیار کر چکا ہے۔

"میرے پاس اگرچہ کچھ پیسے تھے مگر میں کسی ہوٹل میں جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ میں نے وہ رات میو اسپتال کے لان میں گزاری تھی جہاں اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا کوئی نہ کوئی مریض اسپتال میں داخل تھا۔

"دن چڑھے میں نے ایک بار پھر بشارت کی تلاش شروع کر دی لیکن مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا البتہ میں کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھ لگ گئی جنہوں نے مجھے مسلم ٹاؤن کے ایک رفاہی ادارے میں پہنچا دیا۔

"دارالامان میں میرے جیسی اور بھی بے سہارا لڑکیاں موجود تھیں۔ انہیں وہاں کام بھی سکھائے جاتے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ رفاہی ادارہ حافظ عبدالرشید کی نگرانی میں چل رہا تھا جس کے تمام اخراجات حافظ عبدالرشید برداشت کرتا ہے۔ میں دو تین ہفتے اس ادارے میں رہی اور پھر ایک روز حافظ عبدالرشید وہاں آیا اور وہ مجھے اپنی کوٹھی میں لے آیا۔

"میں تین سال اس کوٹھی میں رہی۔ حافظ عبدالرشید مجھے بیٹی کہا کرتا تھا۔ وہ واقعی بہت نیک اور بہت شریف آدمی ثابت ہوا لیکن گزشتہ رات اس کی نیکی اور شرافت کا پول

کھل گیا۔" نجمہ خاموش ہو گئی۔

ماں جی، سلمٰی اور اے ایس پی اشرف خاموش بیٹھے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ نجمہ کئی منٹ خاموش رہی تو اشرف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا..... گزشتہ رات کیا ہوا تھا؟"

"حافظ عبدالرشید نے میرا سودا کر دیا۔ ایک عرب شیخ کے ہاتھ اپنی منہ بولی بیٹی کو بیس لاکھ میں بیچ دیا۔" نجمہ نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیا.....؟" وہ تینوں اچھل پڑے۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔" ماں جی نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "حافظ عبدالرشید تو بہت نیک اور پرہیزگار آدمی ہے۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔"

"تین سال تک میں بھی یہی سمجھتی رہی تھی۔" نجمہ نے جواب دیا۔ "گزشتہ رات اگر سب کچھ اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا۔ حافظ نے عرب شیخ سے میری قیمت بھی بیس لاکھ روپے وصول کر لی ہے۔ میں رات بھر کانٹوں پر لوٹتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں کس پر اعتماد کروں۔ ہر طرف خونخوار بھیڑیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ انسان انسان نہیں رہا شیطان بن گیا ہے۔ کاش! میرا بھیا مجھے مل جاتا۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں بیٹی۔ حوصلہ رکھو۔" ماں جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ "اب تم محفوظ جگہ پر ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ تمہارا بھائی بھی انشاء اللہ ضرور مل جائے گا اور حافظ عبدالرشید جیسے لوگوں کو بھی سزا ضرور ملے گی۔ مگر تم یہاں تک کیسے پہنچی تھیں؟"

نجمہ اس کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ رونے سے اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو گیا تھا۔

"میں نے غلط کہا تھا کہ غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔" نجمہ نے ہچکی بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "رات تین بجے میں حافظ عبدالرشید کے گھر سے نکلی اور چھپتی چھپاتی اس طرف آگئی اور پھر چوکیدار کو دیکھ کر اس کی نظروں سے بچنے کے لئے میں اس کوٹھی کی دیوار پھاند کر اندر آگئی۔ میں دوڑتے دوڑتے بری طرح تھک چکی تھی۔ میری ٹانگیں شل ہو گئی

تھیں۔ نرم گھاس پر لیٹی تو آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر پتہ نہیں کب میں وہیں پڑے پڑے سو گئی۔"

"اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔" ماں جی نے کہا۔ "اب تم بالکل پریشان مت ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

اے ایس پی اشرف پوری توجہ سے نجمہ کی باتیں سنتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں نجمہ نے جو کچھ بھی کہا تھا اور میں جھوٹ اور جھانسے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں تھا اور پھر وہ نجمہ کو لے کر الگ بیٹھ گیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس سے سوال جواب کرتا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" آخر کار اس نے کہا۔ "تم اطمینان سے یہاں رہو۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ میں حافظ عبدالرشید کا بھی بندوبست کرتا ہوں اور تمہارے بھائی کو بھی تلاش کروں گا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے..... بشارت..... یہ نام مجھے کچھ سنا ہوا سا لگتا ہے۔"

"اس کا نام بشارت علی ہے۔ مجھے چوہدری عمر نے بتایا تھا کہ بشارت جب اس کے پاس مکان کا حساب لینے آیا تھا تو اس نے اپنا نام بشارت بتایا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تلاش کرلوں گا اسے۔" اشرف نے کہا۔

اس نے اپنی ماں اور بہن سے علیحدگی میں کچھ باتیں کیں اور دفتر کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ حافظ عبدالرشید کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جیسے آدمی پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہو گا۔

ماں جی نجمہ کو تسلی دلاسے دیتی رہیں اور پھر سلمٰی نجمہ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ دونوں ہم عمر تھیں جلد ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئیں۔ سلمٰی اسے اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاتی رہی۔

چھ بجے کے قریب اشرف کا فون آیا۔ کال سلمٰی ہی نے ریسیو کی تھی۔ اس نے بتایا کہ مصروفیت کی وجہ سے وہ رات کو دیر سے گھر آئے گا۔ پولیس کی ڈیوٹی ایسی ہی تھی کبھی تو وہ شام پانچ بجے گھر آجاتا اور کبھی اسے رات گھر سے باہر گزارنی پڑتی تھی۔

اس روز اس کی واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی تھی۔ سب لوگ نو بجے ہی کھانا کھا چکے تھے۔ اشرف کپڑے بدل کر کھانے کی میز پر بیٹھا تو سلمٰی اور ماں جی بھی اس کے پاس

بیٹھ گئیں۔ نجمہ کمرے ہی میں تھی۔

"کچھ معلوم کیا بیٹا؟" ماں جی نے پوچھا۔

"آج اسی سلسلے میں مصروف رہا ہوں ماں جی۔" اشرف نے جواب دیا۔ "حافظ عبدالرشید کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ایسے لوگوں پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے بہرحال اپنے افسران کو قائل کر لیا ہے۔ کل سے حافظ عبدالرشید کے خلاف خفیہ انکوائری شروع ہو جائے گی لیکن صرف نجمہ کا بیان ہی کافی نہیں ہو گا۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لئے مزید ٹھوس ثبوت درکار ہوں گے۔ یہ کیس مجھے ہی دے دیا گیا ہے۔ میں نے اپنے چند اعتماد کے آدمی تحقیقات پر لگا دیئے ہیں۔ اس کے دارالامان کے بارے میں بھی تحقیقات کی جا رہی ہیں اور یہ بھی معلوم کیا جائے گا کہ حافظ عبدالرشید کے ذرائع آمدنی کیا ہیں اور اس کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی ہے۔ انشاء اللہ چند روز بعد کوئی نمایاں صورت حال سامنے آئے گی۔"

"اور نجمہ کے بھائی کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟" ماں جی نے پوچھا۔

"جی ماں جی۔" اشرف نے جواب دیا۔ "اس سلسلے میں بھی کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔ میں نے شہر کے تمام تھانوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ بشارت نام کا ایک جیب تراش نسبت روڈ تھانے کی حدود میں سرگرم تھا لیکن چند روز پہلے وہ اچانک ہی لاپتہ ہو گیا۔"

"کہاں لاپتہ ہو گیا؟" ماں جی نے اسے گھورا۔

"دراصل چند ہفتے پہلے رنگ محل کے علاقے میں رہزنی کی ایک واردات ہوئی تھی جس میں ایک مالدار شخص کے دو آدمی مارے گئے تھے۔ ایک رہزن شدید زخمی ہوا تھا اور دوسرا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ زخمی رہزن اسپتال میں نیم بے ہوشی کی حالت میں بشارت کا نام پکارتا رہا۔ اس وقت وہاں پر موجود ایک اے ایس آئی نے یہ سمجھا کہ بشارت اس زخمی رہزن کا وہ ساتھ ہو گا جو فرار ہو گیا تھا۔ زخمی رہزن کا تعلق نسبت روڈ کے ایک بدنام اڈے سے تھا۔ اس اے ایس آئی کو یقین تھا کہ بشارت اس اڈے پر چھپا ہو گا۔ اس نے افسران کو اطلاع دیئے بغیر چند کانسٹیبلوں کے ساتھ اس اڈے پر چھاپہ مار دیا۔ بشارت وہاں موجود تھا۔ وہ تو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر اے ایس آئی کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا۔ غیر قانونی چھاپہ مارنے کے جرم میں اے ایس آئی کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔ وہ اس وقت

جوڈیشل جیل میں ہے۔ کل میں اس سے بھی ملاقات کروں گا اور بشارت کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا جو اسی روز سے لاپتہ ہے لیکن اس دوران میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "چند روز پہلے شکرا نامی زخمی رہزن کو اسپتال سے فرار کرا لیا گیا ہے۔ اس کارروائی میں ایک عورت اور ایک مرد نے حصہ لیا تھا جو نقلی نرس اور ڈاکٹر بن کر اسپتال گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں ڈیوٹی پر موجود ایک پولیس والا بھی مارا گیا تھا۔ اس کیس کے تفتیشی افسر کا کہنا ہے کہ شکرے کا ساتھی بشارت ہو سکتا ہے جس نے کسی عورت کے ساتھ مل کر یہ کارروائی کی تھی اور دو تین روز پہلے اچھرہ پولیس نے اسپتال کی ایک سابق نرس کو بھی شک کی بنا پر حراست میں لیا تھا جس نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ تین دن تک اس زخمی قیدی کی مرہم پٹی کرتی رہی ہے جسے اسپتال سے فرار کرایا گیا تھا۔ اسے ایک عورت اور ایک مرد آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاتے تھے۔ اس نے ان دونوں کا جو حلیہ بتایا ہے وہ وہی ہے جو اسپتال میں اس رات ڈیوٹی پر موجود سنتریوں نے بتایا تھا۔ پولیس بہرحال انہیں تلاش کر رہی ہے۔ ایک سراغ بھی ملا ہے لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔"

ماں جی اور سلمٰی خاموشی سے اشرف کی طرف دیکھتی رہیں' اس نے جو صورت حال بتائی تھی وہ بڑی خوفناک تھی۔ اگر ان وارداتوں میں ملوث وہ بشارت ہی تھا تو اس کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی تھی۔ معاملہ تین آدمیوں کے قتل کا تھا۔

"ماں جی۔" اشرف نے کہا۔ "آپ اس لڑکی کو ابھی کچھ مت بتائیے۔ پوچھے تو یہی کہئے کہ اس کے بھائی کو تلاش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔"

"ہاں بیٹا..... ابھی تو اسے جھوٹی تسلیاں ہی دینی پڑیں گی۔" ماں جی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ "بڑا ظلم ہوا ہے اس کے ساتھ۔ وہ بے چاری اپنے بھائی کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اسے جب پتہ چلے گا تو وہ شاید....."

"ابھی تو محض شبہ ہے کہ وہ شخص ہو سکتا ہے۔" اشرف نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہو سکتا ہے وہ کوئی اور ہو اور بشارت محض خوف کی وجہ سے روپوش ہو گیا ہو۔ بہرحال اس کی تلاش کے لئے میری کوشش جاری رہے گی۔ آپ فی الحال خاموش ہی رہئے۔"

اشرف کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور وہ جیسے ہی کرسی گھسیٹ کر مڑا اپنی جگہ پر کھڑا

رہ گیا۔ اس کی نظریں نجمہ کے چہرے پر جم گئیں جو کمرے کے دروازے کی چوکھٹ سے لگی کھڑی ویران سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

پولیس بڑی سرگرمی دکھا رہی تھی۔ اخبارات میں روزانہ شکرے کے فرار کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خبر شائع ہو رہی تھی اور ان خبروں میں بشارت کا نام ابھی تک نہیں آیا تھا۔ جس سے بشارت اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پولیس کو بشارت پر کوئی شبہ نہیں ہو سکا تھا۔

جب پولیس نے ماسی ارشاد بی بی سے پوچھ گچھ کی تھی تو اس نے نہ صرف گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا بلکہ اس عورت اور آدمی کا حلیہ بھی بتا دیا تھا جو اسے اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ بشارت کا حلیہ بہت واضح تھا۔ اسے شناخت کیا جا سکتا تھا جبکہ سنیتا کو شناخت کرنا مشکل ہوتا۔

بشارت کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا تھا لیکن ظاہر ہے وہ قید ہو کر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی تھی۔ بال بڑھا لئے اور داڑھی صاف کروا دی۔ آنکھوں میں لینس لگے رہنے دیئے۔ آنکھوں کی رنگت ہی اسے اصل بشارت سے ذرا مختلف کئے ہوئے تھی۔

پولیس کے پاس ابھی تک ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ رنگ محل والی واردات میں بشارت بھی ملوث تھا۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا تھا دو تین منٹ کے اندر اندر ہوا تھا۔ خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ پہلی گولی چلتے ہی لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے تھے کسی نے توجہ نہیں دی تھی کہ رقم والا بیگ لے کر بھاگنے والا کون تھا۔ چوہدری عمر کا منیجر شہاب الدین بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ڈر کے مارے ایک گاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا اس نے بھی حملہ آوروں کو دیکھا ہو گا لیکن وہ بشارت کو پہچان نہیں سکا تھا حالانکہ کچھ عرصے پہلے بشارت جب اپنے مکان کا حساب لینے چوہدری عمر کے دفتر میں گیا تو شہاب الدین بھی وہاں موجود تھا۔

دراصل وہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے چہرے پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔ لوگوں نے لاشیں گرتے ہوئے اور ایک حملہ آور کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ کسی نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی ہو گی کہ فرار ہونے والا کون تھا۔

اسپتال میں جب شکرے نے نیم بے ہوشی میں بشارت کا نام پکارا تھا تو ایک پولیس آفیسر

کو شبہ ہوا تھا کہ فرار ہونے والا بشارت نام کا وہ شخص شکرے کا ساتھی ہو سکتا ہے۔ اس نے افسران کو اطلاع دیئے بغیر نسبت روڈ والے ڈیرے پر چھاپا مار دیا جس کے نتیجے میں جانو چاچا اس کے ہاتھوں مارا گیا اور وہ جونیئر پولیس آفیسر خود مصیبت میں پھنس گیا۔ صرف اس نے ایک لمحے کو ٹارچ کی روشنی میں بشارت کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ بشارت کون ہے اور وہ جونیئر پولیس آفیسر خود حراست میں تھا۔

بشارت کے خیال میں اگر حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے گھر سے باہر نکلا جائے تو اسے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا اور اس لئے اس نے سر کے بال بڑھا کر داڑھی منڈوالی تھی۔

اس روز وہ اکیلا ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر سڑک پر واقع دکانوں کے سامنے وہ رک گیا۔ وہ چند روز سے یہاں نہیں آیا تھا لیکن اس سے پہلے کوئی نہ کوئی سودا لینے کے لئے یہاں آتا تھا۔ اس نے کونے والے کیبن سے گولڈ لیف کا ایک پیکٹ خریدا اور وہاں سے ہٹ کر سڑک پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ شکرے کے لئے روزانہ یہاں سے سگریٹ خریدا کرتا تھا اور کیبن والے سے کچھ گپ شپ بھی ہو جاتی تھی لیکن آج کیبن والے نے بالکل اجنبیت کا اظہار کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے بغیر داڑھی کے نہیں پہچان سکا تھا۔

اس سڑک پر پرائیویٹ گاڑیوں کی آمدورفت تو رہتی تھی لیکن رکشہ ٹیکسیوں کی آمدورفت کم تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اسے ایک رکشہ مل سکا تھا۔

جب وہ لکشمی چوک پر پہنچا تو آٹھ بج چکے تھے۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ بشارت نے کنگز ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑا کافی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اپنے گروہ کا کوئی نہ کوئی لڑکا ضرور مل جائے گا۔ یہ بارونق علاقہ تھا۔ لکشمی چوک کے ساتھ ہی ایبٹ روڈ تھا جہاں کئی سینما گھر تھے۔ جیب تراش لڑکے اس علاقے میں شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے۔

بشارت آدھے گھنٹے تک کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا لیکن اسے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ وہ چوک پار کر کے نسبت روڈ پر آگیا اور ٹہلنے والے انداز میں آگے چلتا رہا۔

ڈیرے والی گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ڈیرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ آگے نکلتا چلا گیا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ واپس مڑا اور پھر

محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا گلی میں داخل ہو گیا۔

گیٹ میں داخل ہو کر وہ ایک لمحے کو رکا۔ سامنے لکڑی کے کھمبے پر بلب جل رہا تھا۔ طویلے کا منظر وہی تھا جو وہ عرصے سے دیکھتا آرہا تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو ایک طرف ایک گھوڑا بھی بندھا ہوا نظر آیا جو اسے دیکھ کر ہنہناتے ہوئے اگلا ایک پیر زمین پر مارنے لگا۔ بشارت ایک لمحے کو رکا اور پر آگے بڑھ کر اس طرف مڑ گیا جہاں وہ کمرہ تھا۔

کمرے میں بتی جل رہی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بشارت دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے قریب آڑ میں کھڑا ہو گیا اور اندر سے باتوں کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر شاید دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کی آواز سے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ وہ قدم بڑھا کر دروازے کے سامنے آگیا۔

اندر بیٹھے ہوئے دونوں آدمی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بشارت نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا تھا۔ وہ کوچوان عزیز تھا جبکہ دوسرا آدمی اس کے لئے قطعی اجنبی تھا۔

"کون ہو بھئی تم..... کس سے ملنا ہے؟" کوچوان عزیز اٹھ کر دروازے کے قریب آگیا۔

"حیرت ہے۔ تم اپنے پرانے دوست کو نہیں پہچان سکے۔" بشارت نے کہا۔

"اوئے بشارت باؤ....." عزیز کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گیا۔ "رب دی سوں..... میں نے تمہیں نہیں پہچانا ہے۔ اگر بولتے نہیں تو میں تو شک میں پڑ جاتا۔ آؤ..... آؤ..... اندر آجاؤ۔"

بشارت اندر داخل ہو کر الجھی ہوئی نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو دری پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ عزیز کے منہ سے بشارت کا نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ استاد گاما ہے۔ اوئے وہی..... شدرے والا گاما استاد۔" عزیز نے ان کا تعارف کرایا۔

گامے کا نام بشارت کے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس کا گروہ راوی کے پل کے دوسرے طرف شاہدرے کے علاقے میں کام کرتا تھا۔

"یہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟" بشارت نے عزیز سے پوچھا۔

"نہیں۔ پہلے گڑبڑ تھی۔ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ پر تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟" عزیز نے پوچھا۔

"میں کچھ عرصے کے لئے شہر سے باہر چلا گیا تھا اور یہاں کے کیا حالات ہیں؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں تو شروع میں بڑی گڑبڑ رہی۔ پولیس کے ڈر سے لڑکوں نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا تھا لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ کچھ لڑکے واپس آ گئے ہیں۔"

"اور پولیس..... وہ لوگ تنگ نہیں کرتے؟" بشارت نے پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے بشارت باؤ۔" عزیز کے بجائے استاد گامے نے جواب دیا۔ "اس قسم کے جرائم کے اڈے بند ہو جائیں تو پولیس کا کاروبار بھی ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ پولیس تو ہم جیسے لوگوں کی خود حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اگر ہمیں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے تو پولیس والوں کو بھی فاقے کرنا پڑیں۔ خالی تنخواہ میں ایک وقت کا چولہا بھی نہیں جلتا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" بشارت نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پولیس اگر دیانت داری سے کام کرے تو ہم جیسے لوگ جرائم کی دلدل میں نہ پھنسیں۔"

"مجھے دیکھ لو بشارت باؤ۔" استاد گامے نے کہا۔ "میں نے بی اے کی ڈگری لی ہوئی ہے۔ نوکری کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک مرتبہ محلے میں کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ مجھے ایک ہفتے کے لئے جیل بھیج دیا گیا اور اسی ایک ہفتے نے میری زندگی بدل دی۔ پولیس نے مجھے کہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ مجھے شرافت کی راہ چھوڑ کر مجرمانہ زندگی اپنانے پر مجبور کیا گیا۔"

"یہ پولیس والے نہ خود حق حلال کی کھاتے ہیں نہ دوسروں کو کھانے دیتے ہیں۔" عزیز نے کہا۔ پھر بشارت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بشارت باؤ۔ یہ شکرے والی بات اپنی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ پتہ نہیں وہ عورت اور آدمی کون تھے جو اسے اسپتال سے بھگا لے گئے۔"

"ہوں گے کوئی اس کے ہمدرد۔" بشارت نے کہا۔ "ویسے یہاں بھی پولیس تو آتی ہو گی۔ کچھ ٹوہ لینے کے لئے۔"

"نہیں..... یہاں کوئی نہیں آیا۔" عزیز نے جواب دیا۔

بشارت تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہا۔ اس دوران میں ان کے گروہ کا ایک لڑکا بھی آ گیا تھا۔ بشارت کا یہاں آنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ پولیس اس کے پیچھے نہیں تھی۔ وہ عزیز وغیرہ سے رخصت ہو کر ڈیرے سے باہر آ گیا۔

لکشمی چوک پر وہ رتن سینما کی طرف مڑ گیا۔ ابھی اس نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے رک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ آدمی اس کے لئے قطعی اجنبی تھا جو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" بشارت نے کہتے ہوئے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

"لیکن میں نے تمہیں پہچان لیا ہے بشارت۔" اس شخص نے کہا۔

بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں غلام سرور ہوں۔ گوالمنڈی تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل۔" اس شخص نے کہا۔ "لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم سے تو کئی ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔ حیرت ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکے۔"

بشارت کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ اب اس نے غلام سرور کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک دو مرتبہ اس سے بھتہ وصول کرنے بھی آیا تھا۔

"آؤ..... کہیں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔" غلام سرور نے کہا۔

وہ پیدل چلتے ہوئے لاہور ہوٹل والے چوک پر آ گئے۔ بشارت محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ اسے کسی جال میں تو نہیں پھنسایا جا رہا۔ وہ چوک پار کر کے منٹگمری روڈ پر ایک ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ قدرے پُرسکون جگہ تھی اور وہ یہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔ غلام سرور نے ویٹر کو چائے کے لئے کہہ دیا اور بشارت کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم شاید اب بھی ڈر رہے ہو۔" وہ بولا۔ "میں تمہارا دوست ہوں۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

بشارت خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس دوران میں ویٹر نے ان کی میز پر چائے سرو کر دی تھی۔

"میں نے تمہیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے لکشمی چوک پر دیکھا تھا۔" غلام سرور نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں جیسے ہی تمہاری طرف بڑھا' تم چوک پار کر کے نسبت روڈ چلے گئے۔ اور پھر میں نے تمہیں ڈیرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے ڈیرے میں جانا مناسب نہیں سمجھا اور باہر کھڑے رہ کر انتظار کرنے لگا۔ اور ساز..... کہاں غائب رہے۔"

"شکرے کی وجہ سے یہاں کے حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑا۔" بشارت نے جواب دیا۔ اب اسے کسی حد تک اطمینان ہو گیا تھا کہ غلام سرور اسے کے خلاف کوئی چال نہیں پھیلا رہا۔ اس نے بھی چال چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"شکرا کہاں ہے؟" غلام سرور نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "میں جیب تراش ضرور ہوں' ہم دونوں نے ایک ساتھ طویل عرصے تک کام کیا ہے لیکن تم بھی جانتے ہو کہ میں کبھی کسی سنگین جرم میں ملوث نہیں رہا۔ شکرے نے بھی کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا۔ رنگ محل میں جو کچھ ہوا اس پر مجھے حیرت ہے اور پھر جب پولیس نے مجھے گرفتار کرنے کے لئے ڈیرے پر چھاپہ مارا تو میں ڈر کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھے شبہ تھا کہ مجھے بھی اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

"پولیس کو تم پر شبہ تھا۔" غلام سرور نے کہا۔ "وہ چھاپہ اگرچہ غیر قانونی تھا لیکن اس کے بعد تمہارے بارے میں بھی تحقیقات کا فیصلہ کیا گیا۔ پولیس نے تمہارا ماضی کھنگال ڈالا۔ جیل کی رپورٹ اور تمہارے محلے میں بھی پوچھ گچھ کی گئی جس سے آخر کار یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ تم قتل جیسے سنگین جرم میں ملوث نہیں ہو سکتے۔ اگر تم پکڑے گئے تو تمہارے خلاف زیادہ سے زیادہ جیب تراشی جیسے الزامات کی کارروائی ہو سکتی ہے۔ تم روپوش رہ کر اپنے آپ کو مشتبہ بنا رہے ہو۔ تمہارا ڈیرہ دوبارہ آباد ہو گیا ہے۔ تم دوبارہ یہاں آ سکتے ہو۔ تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "ایک لڑکے سے ملنا تھا اس لئے آج وہاں چلا گیا تھا۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسی جگہوں سے دور ہی رہوں۔"

"تو کیا کرو گے؟" غلام سرور نے اسے گھورا۔

"سب سے پہلے میں اپنی بہن کو تلاش کروں گا۔" بشارت نے کہا۔

"بہن!" غلام سرور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں..... میری بہن..... جسے بچپن میں غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے اور اسے بچانے کی کوشش میں ہی پولیس نے مجھے جیب تراش سمجھ کر پکڑ لیا تھا اور جیل بھجوا دیا تھا اور میں آج تک اسے تلاش کر رہا ہوں۔"

"خدا کرے تمہاری بہن مل جائے۔ ویسے....." غلام سرور ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "جو اس راستے پر آ جاتا ہے واپس نہیں لوٹ سکتا۔"

"میں جانتا ہوں۔" بشارت نے جواب دیا۔

"ہاں ایک بات یاد آ گئی۔ تمہیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔" غلام سرور نے کہا۔ "محمد اشرف نام کا ایک اے ایس پی شہر کے تمام تھانوں سے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہے۔"

"محمد اشرف..... اے ایس پی۔" بشارت بڑبڑایا۔ "کیوں؟ کیا وہ مجھے کسی کیس میں پھنسانا چاہتا ہے؟"

"اس کا نہ تو ہمارے علاقے سے تعلق ہے اور نہ ہی شکرے والے کیس سے۔" غلام سرور نے جواب دیا۔ "لیکن وہ تمہارے بارے میں معلوم کر رہا ہے۔ ہمارے تھانیدار کے پاس بھی اس کا فون آیا تھا۔ اسے بتا دیا گیا کہ تم کچھ عرصے پہلے تک تو اسی علاقے میں تھے پھر لاپتہ ہو گئے۔ اے ایس پی اشرف بہت سخت گیر اور فرض شناس آفیسر ہے۔ اس کا تعلق ایک دولت مند زمیندار گھرانے سے ہے۔ وہ شوقیہ طور پر اس محکمے میں آیا تھا۔ دولت کمانے کے لئے نہیں۔ رشوت سفارش اس کی لغت میں نہیں۔ اسے تمہاری تلاش کیوں ہے؟ یہ میں نہیں جانتا لیکن تم اس سے دور ہی رہنا۔"

"اس اطلاع کے لئے شکریہ۔" بشارت نے کہتے ہوئے جیب سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔ "یہ رکھ لو۔ بچوں کے لئے کچھ لے جانا۔"

غلام سرور اخلاقاً انکار کرتا رہا پھر اس نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیا۔ "اگر تم واقعی جرائم سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ یہ شہر چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے

جاؤ جہاں تمہیں کوئی نہ جانتا ہو اگر تم اس شہر میں رہو گے تو اپنا دامن نہیں بچا سکو گے۔" غلام سرور نے کہا۔

بشارت نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ غلام سرور سے اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں اور اسے یہ بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ پولیس کو اس پر قتل کا شبہ نہیں تھا۔

بشارت میکلوڈ روڈ سے ٹیکسی پکڑ کر ٹکسالی گیٹ اپنے پرانے محلے آ گیا۔ نہ جانے اسے یہ یقین کیوں تھا کہ نجمہ کبھی نہ کبھی اس مکان پر ضرور آئے گی۔ وہ دو مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا لیکن دونوں مرتبہ مکان پر تالا لگا ہوا ملا تھا۔

آج تالا نہیں تھا۔ اس نے بیل بجا دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد دروازہ کھلا اور اسی لڑکی کی صورت نظر آئی جس سے پہلی مرتبہ سامنا ہوا تھا۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے جی؟" لڑکی نے پوچھا۔

"میں بشارت ہوں۔ دو تین مرتبہ پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں لیکن گھر پر تالا لگا ملا تھا۔ میں دراصل اپنی بہن کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا تھا۔" بشارت نے کہا۔

"اوہ..... آپ ایک منٹ رکئے۔ میں ڈیڈی کو بھیجتی ہوں۔" لڑکی نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد ہی اس کا باپ باہر آ گیا۔ وہ چند لمحے بشارت کو گھورتا رہا پھر اکھڑ لہجے میں بولا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"دراصل مجھے اپنی بہن کی تلاش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن یہاں ضرور آئے گی۔ ہو سکتا ہے کبھی آئی بھی ہو اور....."

"اوہ۔" وہ شخص چونک سا گیا۔ پھر وہ بشارت کو بیٹھک میں لے گیا۔ "کچھ عرصے پہلے ایک لڑکی یہاں آئی تھی۔ اس نے اپنا نام شاید نجمہ بتایا تھا۔"

"وہی..... نجمہ میری باجی کا نام ہے۔ کہاں ہے وہ۔" بشارت جلدی سے بولا۔ طویل عرصے بعد نجمہ کا نام سن کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"یہ تین سال پہلے کی بات ہے۔" وہ شخص بولا۔ "وہ اسے اپنا گھر سمجھ کر ہی آئی تھی اور اسے تمہاری تلاش تھی۔ ہم نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ چلی گئی۔"

"کہاں؟" بشارت نے پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے کچھ پتہ نہیں وہ کہاں گئی تھی۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے۔"

"کیا.....؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شہر میں کئی فلاحی ادارے ہیں۔ جہاں بے سہارا بچوں اور عورتوں کو بھی رکھا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری بہن ایسے ہی کسی ادارے میں پڑی ہو۔ کم از کم ایک ادارے کے بارے میں تو میں جانتا ہوں۔ بڑی نیک نامی ہے اس ادارے کی۔ تم وہیں سے اپنی تلاش شروع کرو۔ وہاں سے تمہیں دوسرے اداروں کے ایڈریس بھی معلوم ہو جائیں گے۔"

"آپ کس ادارے کی بات کر رہے ہیں؟" بشارت نے پوچھا۔

"دارالامان..... مسلم ٹاؤن میں ہے۔ حافظ عبدالرشید نام کا ایک نیک اور مخیر آدمی اس ادارے کے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ مسلم ٹاؤن میں کہیں سے بھی پوچھو گے تو تمہیں پتہ معلوم ہو جائے گا۔"

بشارت اس کا شکریہ ادا کر کے مکان سے باہر آ گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ظاہر ہے وہ ادارہ اس وقت بند ہو گا۔ وہ جب گھر واپس پہنچا تو بارہ بجنے والے تھے۔

"کہیں سے ٹیلی فون ہی کر دیتے یار۔ ہم یہاں پریشان ہو رہے تھے۔" شکرے نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔" بشارت نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سنیتا وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا صورت حال ہے؟" شکرے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پولیس کو پہلے تو یہ شبہ تھا کہ میں بھی رنگ محل والی واردات میں ملوث ہو سکتا ہوں۔" بشارت نے کہا۔ "لیکن میرے بارے میں تحقیقات کے بعد پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ میں اس واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ البتہ پولیس کو اس عورت اور داڑھی والے نقلی ڈاکٹر کی تلاش ہے جنہوں نے تمہیں اسپتال سے فرار کرایا تھا۔"

"تمہیں یہ باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں۔ میرا مطلب ہے۔ تمہارے ملوث نہ ہونے

والی بات؟" شکرے نے پوچھا۔

"لکشمی چوک پر حوالدار غلام سرور مل گیا تھا۔ وہی گوالمنڈی تھانے والا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "ہم تقریباً ایک گھنٹے تک ہوٹل میں بیٹھے رہے۔ یہ سب کچھ مجھے اسی نے بتایا تھا۔ البتہ ایک اور تشویشناک بات معلوم ہوئی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔ "اے ایس پی اشرف نام کا کوئی پولیس آفیسر ہے جو شہر کے تمام تھانوں سے میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہا ہے حالانکہ اس پولیس آفیسر کا ہمارے علاقے کے تھانے اور رنگ محل یا اسپتال والے کیس سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تمہارے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی جا رہی؟" شکرے نے کہا۔ "مجھے خدشہ ہے۔ حولدار غلام سرور سے تمہاری ملاقات اتفاقیہ نہیں ہوئی ہو گی۔ ہو سکتا ہے ڈیرے کی خفیہ نگرانی کی جا رہی ہو اور حوالدار غلام سرور نے تمہارے گرد جال پھینکا ہو تاکہ تم آزادی سے گھومتے پھرتے رہو اور وہ تمہاری نگرانی کر کے مجھ تک پہنچنا چاہتے ہوں۔ ایسی صورت میں ہم تینوں چوہوں کی طرح مارے جائیں گے۔"

"نہیں۔" بشارت مسکرایا۔ "غلام سرور نے تو مجھے یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ اگر میں واقعی جرائم سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا ہوں تو یہ شہر چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ اگر کوئی چال ہوتی تو وہ مجھے یہاں سے چلے جانے کا مشورہ نہ دیتا۔"

"بہرحال، ہوشیار رہنا۔" شکرے نے کہا۔ "بعض اوقات معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے پولیس بڑی گہری چالیں چلتی ہے۔"

"اطمینان رکھو۔" بشارت بولا۔ "اگر ایسا کوئی موقع آیا تو وہ ہمیں ترنوالہ نہیں پائیں گے۔"

"اور اپنی بہن کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟" سنینا نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں اپنے پرانے گھر گیا تھا۔" بشارت نے جواب دیا۔ "وہ تقریباً تین سال پہلے وہاں آئی تھی۔ اس کے بعد وہ پتہ نہیں کہاں چلی گئی۔ ویسے اس شخص نے مجھے مشورہ دیا کہ رفاہی اداروں سے معلوم کروں جہاں بے سہارا عورتوں اور بچوں کو رکھا جاتا ہے۔ اس نے مسلم ٹاؤن میں ایک ادارے کا پتہ بتایا ہے۔ میں صبح جا کر معلوم کروں گا۔"

وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر بشارت اپنے کمرے میں آ گیا۔ سنینا بھی آ کر بستر پر

لیٹ گئی تھی۔ وہ تو جلدی سو گئی مگر بشارت جاگتا رہا۔ وہ نجمہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی۔

بشارت دیر سے سویا تھا اور صبح اس کی آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ نہاتے ہوئے نہ جانے کس طرح اس کی ایک آنکھ سے لینس نکل کر گر گیا۔ بشارت نے دوسرا لینس بھی نکال دیا۔ اس کے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسپتال میں پولیس والوں نے اس کی نیلی آنکھیں دیکھی تھیں اور اب نیلی آنکھیں اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھیں۔ ماسی ارشاد بی بی نے بھی پولیس کو اس کا جو حلیہ بتایا تھا اس میں داڑھی کے ساتھ نیلی آنکھوں کا تذکرہ تھا۔ داڑھی سے اس نے پہلے ہی نجات حاصل کر لی تھی اور اب آنکھوں کی رنگت بھی بدل گئی تھی اور اسے یقین تھا کہ اب ماسی ارشاد بی بی بھی اسے شناخت نہیں کر پائے گی۔

سنینا بھی بشارت کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ بال گھنگریالے ہو جانے سے اس کے حلیے میں بھی بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔

مسلم ٹاؤن میں دارالامان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ ادارہ ایک بہت بڑی دو منزلہ کوٹھی میں قائم تھا لیکن وہاں چوکیدار کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

"یہ ادارہ تو کئی روز پہلے بند کر دیا گیا ہے۔ اب یہاں نہ تو کام ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کی رہائش ہے۔" چوکیدار نے بتایا۔

"اور یہاں جو بے سہارا عورتیں رہائش پذیر تھیں وہ کہاں گئیں؟" بشارت نے پوچھا۔

"انہیں سرکاری دارالامان میں بھیج دیا گیا تھا۔" چوکیدار نے جواب دیا۔ بشارت اس سے نجمہ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

"مجھے تو پتہ نہیں جناب۔" چوکیدار نے کہا۔ "میری ڈیوٹی تو ہمیشہ گیٹ پر ہی رہتی ہے۔ میں لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ مینجر سے معلوم کر لیں۔ وہ وحدت کالونی میں رہتی ہے۔ میں آپ کو پتہ بتا دیتا ہوں۔"

بشارت نے چوکیدار کا بتایا ہوا مس عشرت کا مکان نمبر ذہن نشین کر لیا اور وہ دونوں وحدت کالونی کی طرف روانہ ہو گئے۔

وحدت روڈ کے ایک طرف مسلم ٹاؤن تھا اور دوسری طرف وحدت کالونی۔ وہاں پہنچے تو مس عشرت کا مکان تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مس عشرت پینتالیس کے لگ بھگ ایک بھاری بھرکم عورت تھی۔ اس کی آبنوسی رنگت دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ افریقہ کے کسی ملک کی رہنے والی ہو۔ اس کے لہجے میں بڑی کرختگی تھی۔

"نجمہ نام کی تو ہمارے ادارے میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔" اس نے بشارت کی بات سننے کے بعد کہا۔ "بعض لڑکیاں گھروں سے بھاگی ہوتی ہیں اور اپنی اصلیت چھپانے کے لئے نام بھی بدل لیتی ہیں۔ اس کا حلیہ بتاؤ تو شاید میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔"

"حلیہ!" بشارت کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ "اسے دیکھے ہوئے تو برسوں گزر گئے ہیں اب تو وہ بہت بدل گئی ہوگی۔"

"سوری۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" مس عشرت کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گئی۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ اب وہ لوگ جا سکتے ہیں۔ "آپ دوسرے اداروں سے جا کر معلوم کریں آپ کو جس کی تلاش ہے اس کا مکمل حلیہ تو معلوم ہونا چاہئے۔"

بشارت اور منینا تین چار دن تک شہر کے مختلف اداروں سے معلومات حاصل کرتے رہے لیکن کامیابی نہیں ہو سکی۔ کہیں سے بھی نجمہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس نے حافظ عبدالرشید سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسے بتایا گیا کہ حافظ جی آج کل کسی سے نہیں ملتے۔ بشارت کی مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

بات بہت اوپر تک پہنچ چکی تھی۔ حافظ عبدالرشید کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کے خلاف کسی قسم کی تحقیقات ہو رہی ہے۔ اس نے بھی ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے تھے تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں اپنا بچاؤ کر سکے لیکن اے ایس پی محمد اشرف نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس کے چہرے کو بے نقاب کر کے ہی رہے گا۔ ابتدائی تحقیقات کے دوران میں اسے حافظ جی کے خلاف کچھ اور باتیں معلوم ہوئی تھیں لیکن وہ باتیں ایسی نہیں تھیں کہ ان کی پر بنیاد پر مضبوط کیس بنایا جا سکے۔ اپنے اعلیٰ افسران سے بھی اس کا رابطہ تھا اور وہ اپنی تحقیقات سے انہیں آگاہ رکھے ہوئے تھا۔

تحقیقات شروع ہونے کے چار روز بعد ہی بڑے ڈرامائی انداز میں دارالامان بند کر دیا گیا تھا۔ ادارے کے رہائشی یونٹ میں تین ادھیڑ عمر عورتیں رہائش پذیر تھیں جنہیں سرکاری

دارالامان کے سپردگی میں دے دیا گیا تھا۔

اے ایس پی اشرف نے ادارے کا ریکارڈ اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے لئے یہ انکشاف خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ اس سے صرف ایک روز پہلے مقامی تھانے میں ادارے میں چوری کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی۔ تحریری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ قیمتی ساز و سامان کے علاوہ چور ادارے کا تمام ریکارڈ بھی لے گئے تھے۔

اے ایس پی اشرف جانتا تھا کہ یہ سارا ڈرامہ ہے۔ اس نے حافظ رشید کے خلاف اگرچہ تحقیقات خفیہ رکھی تھی لیکن اسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا اور اس نے سارا ریکارڈ غائب کر کے تھانے میں چوری کی رپورٹ لکھوا دی تھی۔

اے ایس پی اشرف پر اوپر سے دباؤ پڑنے لگا تھا کہ وہ حافظ عبدالرشید کے خلاف اپنی تحقیقات بند کر دے لیکن اشرف کو اپنے ایس ایس پی کی بھرپور حمایت حاصل تھی اور ایس ایس پی نے ڈی آئی جی کو قائل کر لیا تھا کہ تحقیقات جاری رہنی چاہئے اس نے اب تک کی رپورٹ بھی ڈی آئی جی کو پیش کر دی تھی۔

حافظ عبدالرشید کے خلاف تحقیقات کے ساتھ ہی اشرف نے بشارت کے بارے میں بھی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا لیکن وہ تو اس طرح غائب ہوا تھا جیسے اس دنیا میں اس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

حافظ عبدالرشید نے بھی ایک وزیر سے رابطہ کر لیا تھا۔ اس وزیر کی طرف سے انتظامیہ پر دباؤ بڑھنے لگا کہ حافظ کے خلاف تحقیقات روک دی جائیں۔ یہ احکامات ڈی آئی جی تک پہنچ گئے۔ ڈی آئی جی نے اس معاملے کو نہایت سنگین قرار دیتے ہوئے تحقیقات روکنے سے انکار کر دیا اور اے ایس پی اشرف کو آگے بڑھتے رہنے کا اشارہ دے دیا۔

اور پھر یہ اے ایس پی اشرف کی خوش قسمتی تھی کہ ایک عرب شیخ نے حافظ عبدالرشید کے خلاف فراڈ کی رپورٹ تھانے میں درج کروا دی۔ اس نے حافظ عبدالرشید پر دھوکے سے بیس لاکھ روپے ہضم کر لینے کا الزام لگایا تھا۔ اگر کوئی عام شہری رپورٹ لکھوانا چاہتا تو کبھی نہ لکھی جاتی۔ مگر وہ عرب ریاست عمان کا ایک بااثر شیخ تھا۔ اس نے اس معاملے کو سفارتی ذرائع سے بھی اٹھانے کی دھمکی دے رکھی تھی۔

اور پھر اس سے اگلے ہی روز اے ایس پی اشرف کے مخبر نے ایک ایسے آدمی کا سراغ

بھی لگالیا جس کا تعلق ہیروئن فروشوں کے ایک منظم گروہ سے تھا۔ اس کے قبضے سے آدھا کلو ہیروئن بھی برآمد ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے اے ایس پی اشرف ایک اور معزز ہستی تک پہنچ گیا جس کے بارے میں یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ہیروئن فروشوں کے اس گروہ کا سرغنہ حافظ عبدالرشید ہے جو طویل عرصے سے یہ دھندہ کر رہا ہے۔ اے ایس پی اشرف نے بڑی رازداری سے اس معزز ہستی کو اٹھالیا جس نے ایس ایس پی کے سامنے مزید کئی سنسنی خیز انکشافات کئے۔

اے ایس پی اشرف اب ہر کام بھول کر اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ اس نے حافظ عبدالرشید کے خلاف اپنے ذرائع سے تحقیقات جاری رکھی اور اس کا سارا ماضی کھنگال ڈالا۔ اس نے یہ بھی معلوم کرلیا کہ عبدالرشید دس گیارہ سال کی عمر میں پشاور کے قحبہ خانوں میں لڑکیوں والے کپڑے پہن کر ڈانس کیا کرتا تھا۔ پھر وہ ایک منشیات فروش کے ہاتھ لگ گیا۔ کچھ عرصے پشاور میں اس کے لئے کام کیا اور پھر وہاں سے بھاگ کر لاہور آگیا۔ یہاں بھی وہ ہیرا منڈی کے علاقے میں ایک منشیات فروش کے پاس کام کرتا رہا پھر اس نے اپنا کام شروع کردیا۔

اے ایس پی اشرف نے اس کی زندگی کا ایک ایک کونا کھنگال ڈالا تھا۔ وہ کب کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ اس نے دارالامان کے بارے میں بھی ایک طویل رپورٹ تیار کرلی تھی۔ اب اسے اس ادارے کے ریکارڈ کی بھی ضرورت نہیں تھی اس کے پاس ایسے گروہ موجود تھے جو لڑکیوں کے کاروبار کے حوالے سے حافظ عبدالرشید کے خلاف بیان دینے کو تیار تھے۔

اور پھر اپنی رپورٹس پر مشتمل ضخیم فائل اس نے ایس ایس پی کے سامنے پیش کردی۔ حافظ عبدالرشید کے خلاف اتنے ٹھوس ثبوت جمع ہو گئے تھے کہ انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

☆======☆=====☆

بشارت اب واقعی اس شہر سے نکل جانا چاہتا تھا۔

شکرے نے غلط نہیں کہا تھا۔ پولیس اس کے خلاف واقعی جال پھیلا رہی تھی۔ حوالدار غلام سرور کی ہمدردیاں بھی اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ بشارت کو ڈھیل دینا چاہتے تھے تاکہ وہ مطمئن ہو جائے کہ اس کے خلاف کوئی کیس نہیں ہے اور پھر وہ اس کے ذریعے شکرے تک پہنچنا چاہتے تھے۔

پولیس نے اگرچہ اپنی اس کارروائی کو نہایت خفیہ رکھا تھا مگر ایک اخبار کا رپورٹر اس اسٹوری کو لے اڑا اور اس روز جب بشارت نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

اس رپورٹر کی اطلاع کے مطابق جس روز رنگ محل میں رہزنی اور دہرے قتل کی واردات ہوئی تھی' پولیس نے اسی روز پتہ چلا لیا تھا کہ شکرے کا فرار ہونے والا ساتھی بشارت ہی تھا۔ پولیس اس کی گرفتاری کا منصوبہ بنا رہی تھی کہ ایک اے ایس آئی کی حماقت سے معاملہ بگڑ گیا اور بشارت روپوش ہو گیا۔ پھر اسپتال سے شکرے کو فرار کرالیا گیا۔ پولیس کو توقع نہیں تھی کہ ایسی کوئی کارروائی ہو سکتی ہے۔ بہرحال' اسپتال کے کمرے میں موجود چیزوں پر ملنے والے فنگر پرنٹس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نقلی ڈاکٹر بشارت ہی تھا۔ اس کی ساتھی عورت کے فنگر پرنٹس بھی مل گئے ہیں لیکن پولیس اس کے بارے میں بتانے سے گریز کر رہی ہے۔

بشارت شکرے کو لے کر ایک بار پھر غائب ہو گیا تھا۔ آخر کار کئی روز بعد ایک مشتبہ ریٹائرڈ نرس نے انکشاف کیا کہ ایک عورت اور ایک مرد اسے مفرور زخمی قیدی کے علاج کے لئے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاتے رہے ہیں۔ پولیس نے اس گاڑی کے بارے میں بھی پتہ چلا لیا تھا جو ان دونوں کے استعمال میں تھی۔ وہ گاڑی سنیتا نامی اس عورت کی ملکیت ہے۔ جو بشارت کے ساتھ ان خوفناک سرگرمیوں میں مصروف ہے مگر پولیس یہ پتہ نہیں چلا سکی کہ وہ گاڑی اس وقت کہاں ہے۔

بشارت اب تک پولیس کو چکر دیتا رہا۔ اس کی چالاکی کو دیکھتے ہوئے پولیس نے اپنی حکمت عملی تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور نسبت روڈ والے ڈیرے کی نگرانی شروع کردی اور پولیس کا ایک مخبر ایک جیب تراش گروہ کے سرغنے کے بھیس میں وہاں رہنے لگا۔ پولیس کو یقین تھا کہ بشارت وہاں ضرور آئے گا۔

پولیس کا یہ خیال درست نکلا۔ چند روز پہلے بشارت اس ڈیرے میں داخل ہوا تھا اور جب باہر نکلا تو سادہ لباس میں پولیس کے ایک ہیڈ کانسٹیبل نے دوست بن کر اس سے ملاقات کی اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے یہ باور کرایا کہ اسے پولیس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس پر سنگین جرم کا الزام نہیں ہے۔

پولیس بشارت کو دھوکے میں رکھ کر اس کے ذریعے شکرے تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس طرح ان تینوں کو بیک وقت گرفتار کر لیا جاتا لیکن اخبار کے رپورٹر نے پولیس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

"تم تو حوالدار غلام سرور کی باتوں پر ایمان لے آئے تھے۔" شکرے نے یہ خبر پڑھنے کے بعد اسے گھورا۔ "اب تو تمہیں یقین آگیا نا کہ یہ پولیس والے کسی کے ہمدرد اور دوست نہیں ہوتے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے تمہاری نگرانی کر کے ہمارے اس ٹھکانے کا پتہ چلا لیا ہو اور ہمیں گرفت میں لینے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہوں۔"

"نہیں۔" بشارت نے جواب دیا۔ "اس طرف آتے ہوئے میں نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا ہے۔ اگر اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہو تا تو ہم اطمینان سے یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر بشارت سنیتا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "پولیس تمہارے بارے میں بھی پہلے ہی سے بہت کچھ جانتی ہے۔ کیا اب بھی تم اپنی اصلیت نہیں بتاؤ گی؟"

"ضرور بتاؤں گی۔" سنیتا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "میں نے جو بازی شروع کی تھی اس میں جیت کا کوئی امکان نہیں۔ مجھے اپنی شکست صاف نظر آرہی ہے اس لئے اب میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں نے جب سرحد پار کی تھی تو میرا خیال تھا کہ میرے بارے میں کبھی کوئی نہیں جان سکے گا لیکن آج اخبار میں اپنا نام پڑھ کر مجھے پتہ چل گیا ہے کہ پولیس میرے بارے میں سب کچھ پہلے سے جان چکی تھی۔ میرے محلے میں کوئی نہیں جانتا کہ میرا نام سنیتا ہے یہ نام میں نے صرف تمہیں بتایا تھا۔ محلے والے تو مجھے رضیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اخبار میں اس نام کی اشاعت یہ ثابت کرتی ہے کہ سرحد کے اس طرف قدم رکھتے ہی یہاں کی پولیس میرے نام سے واقف ہو گئی تھی۔

"میں تم دونوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ کیونکہ میں جان گئی ہوں کہ جس مقصد سے سرحد پار کر کے آئی تھی وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی کامیابی کی کوئی امید نہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟" بشارت نے اسے گھورا۔

"میں پڑوسی ملک کی انٹیلی جنس سروس کی ایجنٹ ہوں۔" سنیتا نے جواب دیا۔ "مجھے ایک خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا۔ مجھے یہاں کم از کم دو سال رہ کر اپنے قدم جمانے تھے۔

اپنا اعتماد جمانا تھا اور اصل کام اس کے بعد شروع ہوتا۔ میرے ملک سے کچھ اور ایجنٹ یہاں آتے جو مہمان کی حیثیت سے میرے پاس رہتے اور اپنا کام کرتے۔

"میں ڈیڑھ سال سے یہاں ہوں۔ تین مہینے پہلے مجھے حکم ملا تھا کہ میں دو تین ایسے آدمی تلاش کروں جو ہمارے لئے آلہ کار بن سکیں جن پر بھروسہ کیا جا سکے اور جو بوقت ضرورت جان کی بازی لگا سکیں۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں تھی اور پھر اس روز میں نے رنگ محل میں وہ خوفناک حادثہ واقعہ رونما ہوتے دیکھا۔ تم نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔ میں تمہیں پولیس کے نرغے سے نکال لائی۔ میرا خیال تھا کہ تم دباؤ میں رہ کر ہمارے لئے کام کرو گے اور پھر جب تم نے شکرے کو بھی اسپتال سے فرار کرانے کا منصوبہ بنایا تو میں تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی۔ شکرے کے لئے بھی میں نے وہی سوچا تھا جو تمہارے لئے سوچ رکھا تھا پھر شکرے کو بھی لے آنے میں کامیاب ہو گئے لیکن....."

"لیکن کیا.....؟" بشارت نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کل تمہاری عدم موجودگی میں، میں بھی اپنے گھر گئی تھی۔" سنیتا نے کہا۔ "وہاں میں نے ایک ٹرانسمیٹر چھپا رکھا ہے۔ میں نے ٹرانسمیٹر پر اپنی انٹیلی جنس کے سربراہ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے بتایا کہ بعض وجوہات کی وجہ سے وہ منصوبہ ختم کر دیا گیا ہے جس کے لئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا اور یہ کہ میں بھی یہاں کی انٹیلی جنس کی نظروں میں آچکی ہوں اس لئے میں اب ان کے کام کی نہیں رہی۔ یہ میرا پہلا مشن تھا اور مجھ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر میں پکڑی گئی تو وہ میری کوئی مدد نہیں کریں گے بلکہ مجھے پہچاننے یا شناخت ہی سے انکار کر دیا جائے گا۔

"تم اس شخص کی مایوسی کا اندازہ لگا چکے ہو جسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں بری طرح مایوس ہو گئی ہوں۔ میں اپنے ملک واپس نہیں جا سکتی۔ یہاں بھی انٹیلی جنس کی نظروں میں آچکی ہوں۔ حیرت ہے کہ مجھے اب تک پکڑا کیوں نہیں گیا۔ یا ممکن ہے وہ اس انتظار میں ہوں کہ میں حرکت کروں تو مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔

"میں تم دونوں کی جرأت اور دلیری سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ میں نے سب کچھ تمہیں بتا دیا ہے۔ اگر تم لوگ چاہو تو مجھے قانون کے حوالے کر دو۔ ہو سکتا ہے اس طرح تم

لوگوں کو کوئی رعایت مل جائے۔"

"ہم اپنے قانون کو اچھی طرح جانتے ہیں۔" شکرے نے کہا۔ "ہم آسمان سے تارے بھی توڑ کر قانون کی جھولی میں ڈال دیں تو ہمارے ساتھ کوئی رعایت نہیں۔ ہو گی۔ پولیس سب سے پہلے ہماری کھال ادھیڑے گی اور اس کے بعد کوئی بات کرنے کا موقع دے گی۔"

"تو پھر جو کچھ تم لوگ کرنا چاہتے ہو' میں تمہارے ساتھ ہوں۔" سنیتا نے کہا۔

"پولیس جس طرح سرگرمی دکھا رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری آزادی بلکہ زندگی کے چند روز باقی رہ گئے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ مرنا چاہتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ ہمارے بارے میں زبان بند رکھو گی تو بڑا احسان ہو گا۔" شکرے نے کہا۔

"نہیں۔ میں تم لوگوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔" سنیتا نے جواب دیا۔

بشارت اور شکرا خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ یہ ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جس کا نتیجہ زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں سنیتا کے بارے میں کیا فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس شام بشارت سنیتا کے ساتھ ایک بار پھر نجمہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور خوش قسمتی سے انہیں دارالامان میں کام کرنے والی زلیخا نامی بوڑھی عورت مل گئی۔ اس نے جو انکشافات کئے وہ بہت ہی خوفناک تھے۔

"رب کو جان دینی ہے پتر۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔" زلیخا کہہ رہی تھی۔ "یہ جو حافظ عبدالرشید ہے نا بہت نیچ اور کمینہ آدمی ہے۔ وہ بڑا نیک اور پرہیزگار بنتا ہے مگر کرتوت ایسے کالے کہ سن کر ہی کراہت آتی ہے۔ یہ جو اس نے ادارہ بنایا ہوا ہے نا۔ دارالامان..... یہ بے سہارا عورتوں کی امداد کے لئے نہیں حافظ کی عیاشی کا اڈہ ہے۔ اس کے آدمی سارے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں جو لڑکیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو لڑکیاں اس ادارے میں رکھی جاتی ہیں۔ انہیں بے آبرو بھی کیا جاتا ہے اور انہیں بیچ بھی دیا جاتا ہے اور یہ مشہور کر دیا جاتا ہے کہ لڑکی کو اس کے وارثوں کے پاس پہنچا دیا ہے اس ادارے کی انچارج مس عشرت..... وہ کالی' موٹی عورت..... وہ تو اس کی دلال ہے۔ وہی ایسی ساری کارروائیوں پر پردہ ڈالتی ہے۔ میں تو توبہ توبہ کرتی ہوں پتر..... خدا ایسے لوگوں سے دور

ہی رکھے۔"

"تم نجمہ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔" بشارت نے اسے یاد دلایا۔

"آہو پتر..... وہ بیچاری بڑی دکھی لڑکی تھی۔" زلیخا نے کہا۔ "جب اسے یہاں لایا گیا تو اس کا نام نجمہ ہی تھا مگر رجسٹر میں اس کا نام شبانہ رکھا گیا۔"

"وہ کہاں سے آئی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟" بشارت نے پوچھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔

"پتہ نہیں۔ حافظ کے بندے اسے کہیں سے پکڑ کر لائے تھے۔" زلیخا نے جواب دیا۔

"وہ بیچاری بڑا روئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ بیچاری اپنے ویر کے لئے تڑپ رہی تھی۔ زندگی بھر اپنے آپ کو درندوں سے بچاتے ہوئے دوڑتی رہی اور بھائی کو تلاش کرتی رہی۔ مگر یہ لوگ انسان نہیں شیطان ہیں' کسی مظلوم پر انہیں کب ترس آتا ہے۔"

"پھر..... پھر وہ کہاں گئی؟ ادارہ تو بند ہو چکا ہے۔" بشارت نے بے صبری سے پوچھا۔

"جب اس ادارے میں لایا گیا تو اس کے دو تین ہفتے بعد ہی حافظ رشید اسے اپنی کوٹھی پر لے گیا۔ میں بھی اس کی کوٹھی جاتی رہی تھی۔ وہ شبانہ کو بیٹی کہتا تھا۔ وہ تین سال سے وہاں تھی اور پھر مجھے دلاور نامی اس کے ایک بندے نے بتایا کہ حافظ رشید نے اسے بیس لاکھ میں بیچ دیا ہے۔ دلاور حافظ کا خاص بندہ ہے۔ ادارے میں بھی آتا رہتا تھا۔"

"بیچ دیا۔" بشارت کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"مگر شبانہ اسی رات حافظ کی کوٹھی سے بھاگ گئی تھی۔ حافظ اسی روز سے بوکھلایا ہوا ہے۔ اس لئے اس نے ادارہ بھی بند کر دیا ہے۔ تاکہ کوئی اس کے بارے میں معلوم نہ کر لے۔" زلیخا نے بتایا۔

بشارت کا دل کانپ رہا تھا۔ زلیخا نے شبانہ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے اب اس امر میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ نجمہ ہی تھی۔

اپنی کوٹھی پر واپس آ کر بھی مضطربانہ انداز میں ٹہلتا رہا۔ زلیخا نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ حافظ عبدالرشید کی کوٹھی سے بھاگنے کے بعد نجمہ پکڑی گئی تھی اور کسی پولیس آفیسر کے پاس

تھی۔ حافظ رشید کو پتہ چل گیا تھا وہ خود تو سامنے نہیں آیا مگر اس نے دوسرے لوگوں کے ذریعے اس پولیس آفیسر کو رقم کی پیشکش کی تھی کہ نجمہ کو واپس کر دے مگر وہ پولیس آفیسر اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر تلا ہوا ہے۔

زلیخا اگرچہ اس پولیس آفیسر کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی تھی لیکن بشارت کے ذہن میں بار بار اے ایس پی اشرف کا نام گونج رہا تھا جو شہر کے تمام تھانوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے نجمہ اس کے پاس ہو اور نجمہ کی دکھ بھری کہانی سن کر ہی وہ بشارت کو تلاش کر رہا ہو لیکن یہ ضروری نہیں تھا۔ معاملہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ نجمہ کے بارے میں حافظ عبدالرشید ہی بتا سکتا تھا کہ وہ کس پولیس آفیسر کے قبضے میں ہے۔

"سوچ کیا رہے ہو؟" شکرے نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "ہم ابھی چل کر حافظ سے نجمہ کے بارے میں پوچھ لیتے ہیں۔"

"تم.....؟" بشارت نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اب ٹھیک ہوں بھئی۔" شکرے نے جواب دیا۔ "میرے ہاتھوں میں اب اتنی طاقت آگئی ہے کہ حافظ رشید جیسے شخص کی گردن مروڑ سکوں۔" اور پھر بشارت نے زندگی کی سب سے بڑی بازی لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کار کا اسٹیئرنگ سنینا کے ہاتھ میں تھا۔ آگے بشارت بیٹھا ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر شکرا۔ ان دونوں کے پاس وہ آٹومیٹک رائفلیں تھیں جو اسپتال میں پولیس والوں سے چھینی گئی تھیں۔ دونوں رائفلوں کے میگزین بھرے ہوئے تھے۔

جب وہ حافظ عبدالرشید کی کوٹھی والی گلی میں داخل ہوئے تو رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور پھر ٹھیک اسی وقت ایک پجیرو کوٹھی کے گیٹ سے نکلی۔ اس کا رخ اسی طرف تھا۔ سنینا نے بڑی تیزی سے اپنی کار پجیرو کے سامنے کر دی۔ پجیرو رک گئی۔

پجیرو میں تین آدمی تھے۔ حافظ عبدالرشید اور دو اس کے خاص بندے۔ بشارت بڑی پھرتی سے کار سے اتر آیا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ شکرا رائفل لئے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

"حافظ جی۔ ذرا نیچے آؤ نا تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" بشارت نے اسے رائفل کی زد پر لیتے ہوئے کہا۔

"کون ہو تم اور اس بدتمیزی کا کیا مطلب ہے؟" حافظ غرایا۔

"نیچے اترو تو بتاتا ہوں۔" بشارت نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

پجیرو کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر بشارت نے بڑی پھرتی سے رائفل کی نال اس کے کندھے پر ماردی۔

"کوئی حرکت کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔" وہ غرایا۔

شکرا بھی رائفل سنبھالے کار سے اتر آیا اور اس نے بھی پجیرو کے سامنے کھڑے ہو کر رائفل تان لی۔ حافظ رشید اور اس کے ساتھیوں کو پجیرو سے اترنا ہی پڑا تھا۔

"میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن اپنی اس حرکت پر پچھتاؤ گے۔ میرے ایک اشارے پر تمہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے گا۔" حافظ عبدالرشید غرایا۔

"تمہارا گھناؤنا چہرہ بے نقاب ہو چکا ہے۔ مجھے تمہارے کالے کرتوتوں کا پتہ چل گیا ہے۔" بشارت نے بھی غراتے ہوئے کہا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ نجمہ کہاں ہے۔ میری بہن نجمہ۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں کسی نجمہ کو نہیں جانتا۔" حافظ نے جواب دیا۔

"تم سب کچھ جانتے ہو۔" بشارت بولا۔ "تم نے اس کا نام بدل دیا تھا۔ ہاں شبانہ۔ تم نے اسے بیٹی بنا کر تین سال اپنے گھر میں رکھا اور پھر اس کا سودا کر دیا مگر وہ بھاگ گئی اور تم جانتے ہو وہ کہاں ہے۔"

"اوہ؟" حافظ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "میں نے اس کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ میرے گھر سے نقدی اور لاکھوں روپے کے زیورات لے کر بھاگ گئی تھی۔"

"بکواس کرتے ہو تم....." بشارت چیخا۔ "جن ہاتھوں نے بچپن ہی سے محنت کرنا سیکھا ہو وہ چوری نہیں کر سکتے۔ بتاؤ کہاں ہے وہ؟"

سنینا اس دوران میں گاڑی وہاں سے ہٹا لے گئی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ ہی رکھا تھا تاکہ بھاگنا پڑے تو دشواری پیش نہ آئے۔

حافظ عبدالرشید چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک ہی کوٹھی کے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کے دونوں ساتھی بھی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی لمحے شکرے کی رائفل دہاڑ اٹھی تھی۔ حافظ کے دونوں ساتھی ڈھیر ہو گئے۔ بشارت نے دوڑ کر حافظ رشید

کو پکڑ لیا اور اسے زمین پر گرا کہ اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

"بتاؤ..... نجمہ کہاں ہے؟" وہ حافظ کی پسلیوں پر رائفل کا بٹ رسید کرتے ہوئے غرایا۔

"وہ..... وہ..... اے ایس پی اشرف کے....."

"بشارت..... شکرے..... بھاگو..... پولیس....."

سنیا کی آواز سن کر بشارت چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ دائیں طرف گلی سے پولیس کی ایک گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ حافظ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ بشارت نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی آواز کے ساتھ ہی حافظ رشید کی چیخیں بھی فضا میں گونج اٹھیں۔

بشارت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر کار کی طرف دوڑ لگا دی۔ شکرا بھی دوڑا تھا لیکن اسی لمحے دوسری طرف سے گلی میں پولیس کی ایک گاڑی داخل ہوئی اور پھر دوسرے ہی لمحے دونوں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ بشارت مڑ کر ایک کوٹھی کی طرف دوڑا۔ وہ دیوار پر چڑھ رہا تھا کہ چیختا ہوا نیچے گرا۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک ٹانگ میں' ایک کندھے پر اور تیسری بائیں پہلو میں۔ وہ ایک لمحے کو زمین پر پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر اسی لمحے ایک اور گولی پیٹ میں لگی اور وہ گر پڑا۔

چند منٹ تک فائرنگ ہوتی رہی۔ اس نے چیخوں کی آواز بھی سنی تھی۔ وہ شکرے کے چیخنے کی آواز تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا شکرا سڑک پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا اور اس کے جسم سے بہنے والا خون سڑک پر بہہ رہا تھا۔ کئی پولیس والوں نے بشارت کو گھیرے میں لے لیا۔ رائفلیں اس پر تنی ہوئی تھیں۔

"گگ..... گولی مت..... چلانا۔" بشارت کہہ رہا تھا۔ "میرا نام بشارت ہے..... اگر تم لوگ اے..... ایس پی..... اشرف کو بلا دو تو....."

اسی وقت تین چار آفیسر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں ایک ڈی ایس پی تھا' دو انسپکٹر اور ایک اے ایس پی اشرف۔

"میں اے ایس پی اشرف ہوں۔" وہ آگے بڑھ کر بشارت پر جھک گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ "بتاؤ تم کون ہو اور تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

"مم..... میں..... بشارت ہوں..... بشارت..... علی۔" بشارت رک رک کر بولا۔ "مم..... میری بہن نجمہ..... تمہارے پاس..... اسے ایک مرتبہ..... مجھ سے ملوا دو....."

اے ایس پی اشرف ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اس نے چیخ کر اپنے ایک ماتحت کو حکم دیا اور دوبارہ بشارت پر جھک گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد ایک کار وہاں آ کر رکی۔ دو خواتین نیچے اتریں۔ ایک اے ایس پی اشرف کی بہن سلمیٰ تھی اور دوسری نجمہ.....

"تمہارا بھائی مل گیا ہے۔ نجمہ..... لیکن اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آگے بڑھ کر مل لو اس سے۔" اے ایس پی اشرف نے کہا اور نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے لے آیا۔

نجمہ خون میں لت پت بشارت کو دیکھ کر سناٹے میں آ گئی۔ خون نے خون کو پہچان لیا تھا۔ وہ چیختی ہوئی بشارت سے لپٹ گئی۔

"یہ..... یہ کیا ہو گیا بھیا..... تم..... تم..... تو ڈاکٹر اقبال بننا چاہتے تھے۔ یہ کس راستے پر نکل گئے بھیا....."

بشارت کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ نقاہت اس پر غالب آ رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔

"باجی....." اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ "مم..... میں تو ڈاکٹر اقبال ہی بننا چاہتا تھا مگر..... مجھے..... چور..... ڈاکو اور قاتل بنا دیا گیا..... میں..... جس راستے پر چلا تھا..... وہ بھی بند ہو..... چکا ہے..... انجام تو یہی..... ہونا تھا..... تم..... تم اپنا خیال..... رکھنا۔"

اس کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے مگر آواز نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہو چکی تھیں۔ نجمہ اس سے لپٹ کر دہاڑیں مارنے لگی۔ برسوں بعد اس کا بچھڑا ہوا بھائی ملا تھا تو اپنی زندگی کے آخری موڑ پر.....

بشارت نے بہن کی آغوش میں دم توڑ دیا۔ نجمہ کی دلدوز چیخوں سے فضا کانپ اٹھی۔ اے ایس پی اشرف نے سلمیٰ کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نجمہ کو بانہوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے کار کی طرف لے چلی۔ شکرا ختم ہو گیا تھا۔ سنیا کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔

سلمٰی نجمہ کو لئے کار میں بیٹھ گئی۔ اے ایس پی اشرف کچھ دیر کے لئے ان کے پاس آیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ٹکسالی گیٹ کے ایک خستہ حال مکان سے کئی برس پہلے بوڑھے علی خان کی بیچارگی کی موت سے شروع ہونے والی کہانی آخر کار اس کے بیٹے کی موت پر ختم ہو گئی تھی۔

☆=====ختم شد=====☆